غیر متبدل قوانینِ الٰہی

ڈاکٹر فاروق عزیز

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ

غیر متبدل

قوانینِ الٰہی

ڈاکٹر فاروق عزیز

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ

غیر متبدل قوانینِ الٰہی

از
ڈاکٹر فاروق عزیز

اشاعت اول: اگست 2010ء
اہتمام: ابو الفضل نور احمد
کمپیوٹر لے آؤٹ: فہیم سولنگی
طابع: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی
ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ، کراچی

ہدیہ: =/250 روپے

ایڈریس
حکمتِ قرآن اِنسٹیٹیوٹ
6 سندھی جماعت کو آپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، جوگی موڑ بس اسٹاپ
نیشنل ہائی وے، کراچی 75030
رابطے کیلئے 4213117-021
0300-2707097

Web:www.hikmatequran.org

فہرست مضامین

باب۔۱

باب۔۲

باب۔۳

باب۔۴

باب۔۵

باب۔۶

باب۔۷

پیش لفظ

یہ ایک بدیہی اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہ پوری کائنات اور اس میں موجود تمام اشیاء اصولوں اور قوانین کی ایک ان دیکھی انتہائی کڑی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہیں، جس سے سرِ موانحراف کسی بھی شے کے لیے ممکن نہیں ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کے آگے طوعاً و کرھاً سجدہ ریزہ ہیں۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے جس شے کی جو تقدیر یا تقدیرات متعین کر دی ہیں وہ شے اس سے سرِ موانحراف نہ کرتی ہے اور نہ ہی کر بھی سکتی ہے۔

تاہم اللہ تعالیٰ نے خود اپنی مشیت سے دو انواع، جن و انس کو مختلف تقدیرات کے انتخاب کی اجازت دی ہے۔ یہ انواع اپنی مرضی سے جب چاہیں اور جو چاہیں تقدیر منتخب کر سکتی ہیں۔ تاہم منتخب شدہ تقدیرات کے نتائج بدلنے پر وہ ہر حال میں قادر نہیں ہیں۔ اس صورتِ حال کا لامحالہ منطقی تقاضہ یہ تھا کہ ان انواع کو مختلف النوع تقدیرات کی بابت رہنمائی بھی فراہم کی جاتی، تاکہ یہ انواع مختلف قسم کی تقدیرات کو سوچ سمجھ کر اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس رہنمائی کی فراہمی کو ہدایت کہا جاتا ہے۔ یہ مختلف تقدیرات چونکہ اللہ تعالیٰ نے متعین کی ہیں لہٰذا صرف اور صرف اس کی ذات ہی اس پوزیشن میں ہے کہ وہ اس کی بابت رہنمائی فراہم کر سکے۔ اسی لیے ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ممکن ہے، باقی کوئی بھی ہستی اس قابل نہیں کہ وہ رہنمائی فراہم کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے مختلف علاقوں اور زمانوں میں انبیاء و رسل کو بھیجا جانا درحقیقت اسی رہنمائی کو انسانوں تک پہنچانا تھا۔ یہ رہنمائی قرآن مجید فرقان حمید کی شکل میں یعنی اپنی آخری اور حتمی شکل میں نبی آخر الزماں آنحضرت ﷺ کے توسط سے انسانوں تک پہنچادی گئی ہے۔ اب یہ انسانوں کا کام ہے کہ وہ اس منبعِ رشد و ہدایت سے فیض حاصل کریں اور اُم

الکتاب میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق جو اصول و قوانین دیے گئے ہیں، ان کا اس آخری الہامی کتاب سے استنباط کریں۔

زیرِ نظر کاوش اسی حوالے سے ایک ادنیٰ سی کاوش ہے جس میں قرآن مجید کے بالکل اساسی قوانین کو مستنبط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہے، اس کا فیصلہ تو بہر حال اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت و تکمیل کے ضمن میں حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کے روح رواں جناب ابوالفضل نور احمد صاحب کا میں خصوصی طور پر مشکور ہوں، ان کی مدد و تعاون کے بغیر شاید اس کتاب کا مکمل ہونا ممکن نہ تھا۔

ڈاکٹر فاروق عزیز
شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن
وفاقی اردو یونیورسٹی، گلشن اقبال کیمپس
کراچی۔

باب۔ 1

اللہ تعالیٰ کے قوانین:
ان کی نوعیت و مائیت اور ان کے اقسام

لفظ قانون کی تعریف اس طرح سے کی جاتی ہے کہ "اگر ایسا کرو گے تو ایسا ہو گا اور ہمیشہ ہی ایسا ہو گا۔" سائنس کی زبان میں اسے اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ جب کوئی ایک خاص تجربہ، یکساں ماحول میں دھرائے جانے پر یکساں نتائج دے تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہوا کے ایک عام دباؤ پر پانی ہمیشہ ۱۰۰ درجے سینٹی گریڈ پر ابلتا ہے اور صفر درجہ سینٹی گریڈ پر جم جاتا ہے یا ہوا کی عدم موجودگی میں تمام اشیاء زمین کی طرف ایک یکساں رفتار سے گرتی ہیں یا اس نوعیت کے کئی دیگر مظاہر ہیں جن کی بنیاد پر مختلف مظاہر کے یکساں حالات میں یکساں طرز عمل کو مختلف قوانین کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بین اور ٹھوس حقیقت ہے کہ اس پوری کائنات میں مختلف النوع قوانین جن کا تعلق علم کے کسی بھی شعبے سے ہو، وہ مستقل، آفاقی اور زمان کی قید سے ماوراء ہیں۔ سائنس دان کا بنیادی کام کائنات کا مشاہدہ ہے۔ وہ اپنے اس مشاہدے سے کچھ مواد حاصل کرتا ہے پھر اس مواد کو ایک قابل فہم تنظیم اور ترتیب کے ساتھ جمع کرتا ہے اور ہر درست تنظیم یا ترتیب سے جو نتیجہ یا نتائج حاصل ہوتے ہیں انہیں سائنسی حقائق یا قوانین کا نام دیا جاتا ہے جو کسی صورت

تبدیل نہیں ہوتے۔

یہاں ایک غور طلب نکتہ یہ بھی ہے کہ جب یہ امور طے شدہ ہیں تو انسان بھی تو اسی کائنات کا ایک حصہ ہے۔ جب اس کائنات کی ہر ہر شے مختلف النوع قواعد وضوابط کی ایک کڑی زنجیر میں بندھی ہوئی ہے تو کیا انسانی سرگرمیوں کو ان سے کوئی استثنٰی حاصل ہے؟ ظاہر ہے ایسا نہیں ہے بلکہ قطعی نہیں ہے۔ انسانوں کی منجملہ تمام سرگرمیاں بھی چند مخصوص قواعد و ضوابط کے تحت ہیں جن سے کسی کو، کسی صورت، کسی بھی حوالے سے استثنٰی نہیں ہے۔ اس بات کو ایک مثال کی مدد سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص کسی دو منزلہ مکان کی دوسری منزل کے کسی کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے۔ اگر وہ کتاب گر جاتی ہے تو ظاہر ہے کشش ثقل کے قانون کے تحت وہ کتاب ایک خاص رفتار سے فرش کی جانب گرے گی۔ فرض کیجئے وہ شخص پانی پینا چاہتا ہے پانی اس سے کچھ دور ایک میز پر رکھا ہوا ہے۔ اب ظاہر ہے وہ پانی اس شخص کی خواہش پر خودبخود اس کے پاس نہیں آئے گا، کیونکہ ایسا ہونا کسی بھی طبیعی قانون کی رو سے ممکن نہیں۔ اس شخص کو پانی پینے کے لیے خود پانی کے پاس جانا ہوگا یا کسی دوسرے شخص سے مدد لینی ہوگی۔ اسی طرح وہ شخص اس کمرے کی کھڑکی سے نیچے چھلانگ نہیں لگائے گا، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ مختلف طبیعی قوانین کی رو سے اس کی اس حرکت کا انجام کیا ہوگا۔

غرض یہ کہ اس طرح اس شخص کے کسی بھی فعل پر غور کیجئے اس کے تمام تر افعال مختلف طبیعی قوانین کے تحت ہیں۔ اس تناظر میں مقام تدبر یہ ہے کہ اگر مذکورہ شخص اسی کمرے میں کوئی جھوٹ بولتا ہے یا کسی کو دھوکہ دیتا ہے یا زنا کرتا ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا ان افعال بد کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا؟

صرف اس مفروضہ شخص پر ہی موقوف کیوں؟ اس مثال کو پوری نوع انسانی کے منجملہ تمام افعال پر محیط کر دیجئے تو کیا یہ ممکن ہے نوع انسانی جو افعال انجام دیتی ہے خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ان کا کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو؟ یقیناً نہیں، ایسا نہیں ہے۔ نوع انسانی کے منجملہ تمام افراد کے تمام افعال خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ان کے بھی نتائج مرتب ہوتے ہیں اور بالکل اسی طرح ہوتے ہیں جس طرح عام طبیعی قوانین کے ہوتے ہیں۔ مسئلہ صرف اتنا سا ہے کہ

ان کی جانب سرے سے توجہ نہیں دی گئی ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس جانب سرے سے تحقیق تو کجا غور و فکر کرنے کی بھی زحمت نہیں کی گئی ہے۔ اس حوالے سے قوانین نہ صرف طبیعی قوانین کی طرح ٹھوس اور بین ہیں بلکہ ان کی جانچ بھی سائنسی قوانین کی طرح کی جاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قوانین یا سنۃ اللہ: ان کی نوعیت و ماہیت

جس طرح یہ خارجی کائنات اصولوں اور قوانین کے ایک مجموعے کے تحت ہے یعنی کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے مختلف واقعات کی توضیح اس سے متعلق قانون یا قوانین کی مدد سے کی جاسکتی ہے اور اس حوالے سے پوری کائنات میں مکمل یک رنگی ہے یعنی جو قواعد وضوابط اس زمین پر یا نظام شمسی میں ہمیں ملتے ہیں، سائنس اس یقین کی حامل ہے کہ بعینہ وہی قوانین اس کائنات کے بعید ترین حصے میں بھی اسی طرح موجود ہیں۔

انہی قواعد وضوابط یا قوانین کو اللہ کے قوانین یا سنۃ اللہ کہا جاتا ہے۔ لفظ سنۃ کا مادہ س، ن،ن ہے۔ اس کے معنی دانت کے ہوتے ہیں۔ (سورۃ المائدہ:۴۵) میں یہ اسی معنوں میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معنی چہرہ، صورت، چہرے کے کھلے اور نمایاں حصے، راستے، طریقے، دستور اور قانون وغیرہ کے بھی ہیں، اس کی جمع سنن ہے۔ قرآن مجید میں بیشتر مقامات پر اسے دستور، طریقہ اور قانون وغیرہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے مندرجہ ذیل آیات قرآنی کے حوالے دیئے جاسکتے ہیں۔ (سورۃ بنی اسرائیل:۷۷)، (سورۃ الاحزاب:۳۸)، (سورۃ المؤمن:۸۵)، (سورۃ الفتح:۲۳)، (سورۃ الفاطر:۴۳) اور (سورۃ الاحزاب:۶۲) وغیرہ۔ جہاں تک قرآن مجید میں بیان کردہ ان قوانین کا تعلق ہے ان کا بڑا حصہ انسانی سماج سے متعلق قوانین پر مشتمل ہے۔

اللہ کے قوانین کبھی کسی صورت تبدیل نہیں ہوتے

اس کتاب کا مقصد چونکہ انسانی معاشرے سے متعلق الہامی قوانین کو زیر بحث لانا ہے لہذا اس حوالے سے موضوع بحث صرف انسانی سماج سے متعلق قوانین خداوندی ہی ہیں۔

جہاں تک انسانی سماج کے حوالے سے قوانین خداوندی کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کی کسی بھی دیگر سنت کی طرح اس حوالے سے بھی یہ قوانین لچک سے مکمل ناآشنا ہیں۔ اس امر کا اثبات مندرجہ ذیل آیات قرآنی سے بخوبی ہوتا ہے۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا

"یہ سلوک ہمارے اس سلوک کے مطابق ہو گا جو ہم نے آپ سے پہلے (گذرے ہوئے) اپنے رسولوں کی قوموں کے ساتھ کیا تھا اور آپ ہمارے دستور میں کبھی ردوبدل نہیں پائیں گے۔" (بنی اسرائیل:۷۷)

اس آیت کریمہ میں توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ نفی یا انکار کے لئے لفظ 'لا' آیا ہے۔ یہ نفی جنس کے لیے آتا ہے یعنی یہ جس چیز کی نفی کرتا ہے اس کی پوری پوری جنس کی نفی کرتا ہے۔ جیسے لَا رَيْبَ فِيْهِ "اس میں کسی قسم کے شک وشبہ یا اضطراب والی کوئی بات نہیں ہے۔" (البقرہ:۲) اس تناظر میں اس آیت کریمہ میں لفظ 'لا' صرف اس آیت میں بیان کردہ قانون کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے منجملہ تمام قوانین کے حوالے سے اس امر کی قطعی، واضح اور دوٹوک نفی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی قانون میں کبھی بھی، کسی بھی قسم کا، کوئی ردوبدل، کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہے۔

اس ضمن میں دوسرا اہم نکتہ اس آیت کریمہ میں لفظ 'تجد' کا استعمال ہے۔ اس لفظ کا مادہ و، ج، د ہے۔ اس کے بنیادی معنی کسی شے کو پالینے یا کسی چیز کو جان لینے یا اس کا علم حاصل کر لینے کے ہیں۔ اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ان منجملہ تمام قوانین پر محیط ہے جن کا انسان نے علم یا تو حاصل کر لیا ہے یا تاقیامت کرتا چلا جائے گا۔ ظاہر ہے ان علوم میں انسانی سماج سے متعلق علوم کے ساتھ اس طبیعی کائنات کے بھی تمام قوانین وضوابط شامل ہیں۔

اس حوالے سے اس آیت کریمہ میں تیسرا اہم لفظ 'تَحْوِيْلًا' ہے۔ اس کا مادہ ح، و، ل ہے۔ اس کے بنیادی معنی کسی شے کے تغیر پذیر ہونے یا کسی شے کے ایک حالت سے کسی دوسری حالت میں تبدیل ہو جانے یا دوسری چیزوں سے الگ ہو جانے، کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ مادہ تغیر و تبدل کے حوالے سے (سورۃ الکھف:۱۰۸) میں آیا ہے۔ انسان کے مال،

بدن اور نفس میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ اس کا حال کہلاتی ہیں، اس کے علاوہ حول کے معنی بھیگا ہو جانے کے بھی ہیں۔ کیونکہ اس میں آنکھ اپنی اصل حالت میں نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ اس کے معنی ارد گرد، کسی شے کا کنارہ یا طرف، دو چیزوں کے مابین حائل ہونے، الگ کر دینے، دگرگوں کر دینے، زائل کر دینے، قوت، غلبہ، اقتدار، تصرف، نگاہ، نظر، تیزی، معاملات پر قابو، تدبیر امور اور گواہ یا شاہد کے بھی ہیں۔

اس بنیاد پر اس آیت کریمہ کے آخری الفاظ 'وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا' کا مفہوم اس طرح متعین ہو سکتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے ان تمام قوانین کو جنہیں تم (بہ حیثیت نوع) جان چکے ہو یا جانتے چلے جاؤ گے ان میں کبھی بھی، کسی بھی نوع کا تغیر و تبدل نہیں پاؤ گے۔"

گویا اس آیت کریمہ کی رو سے آنحضرت (ﷺ) سے پہلے جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام آئے اور خود آپ (ﷺ) کا پیغام بھی یہی ہے کہ اللہ کے قوانین کبھی کسی صورت، کسی بھی حوالے سے لچک سے آشنا نہیں ہیں۔ ایسا نہ کبھی پہلے ہوا اور نہ ہی قیامت تک ہو سکے گا۔ بالعموم اس آیت کریمہ یا اس سے ملتے جلتے مفہوم کی آیات کو محض انسانی سماج تک محدود کر دیا جاتا ہے تاہم جیسا کہ عرض کیا گیا آیت کے اپنے الفاظ خود اس محدودیت کی کھلی نفی کر رہے ہیں اور یہ واضح ہے کہ اس کا محیط محض انسانی سماج نہیں بلکہ یہ کل کائنات ہے کیونکہ اس آیت کی رو سے یہ امر اللہ تعالیٰ کے تمام قوانین پر محیط ہے اور یہ قوانین ظاہر ہے صرف انسانی معاشرے سے متعلق نہیں بلکہ پوری کائنات سے متعلق ہیں۔

قوانینِ خداوندی کا بدل بھی ممکن نہیں ہے

جہاں تک ان قوانین کا تعلق ہے از روئے قرآن ان کا بدل بھی ممکن نہیں ہے یعنی کوئی بھی دیگر قوانین ان کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ قوانین اپنی جگہ اتنے جامع، موزوں اور مناسب ہیں کہ نہ تو ان کی صورت میں تغیر ممکن ہے اور نہ ہی کوئی ان کا متبادل ممکن ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کا اثبات مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

"اللہ کے ان قوانین کو جو پہلے سے چلے آ رہے ہیں اور ان قوانین کو بھی جنہیں تم جان لو گے تم ان کا کوئی متبادل نہیں پاؤ گے۔" (الفتح: ۲۳)

اس آیت کریمہ میں لفظ 'تبدیلا' کا مادہ ب، د، ل ہے۔ اس کے معنی اس شے کے ہیں جو کسی دوسری شے کی قائم مقام بن جائے یا اس کا عوض یا بدل ثابت ہو یا کسی شے کو بدل دینا یا اس کے بدلے کسی دوسری شے کو اختیار کر لینا۔ اس کے علاوہ اس کے معنی تغیر و تبدیلی یا تحریف کے بھی ہیں۔

اس بنیاد پر متذکرہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ اللہ کے قوانین خود اپنی جگہ اتنے جامع، خود مکتفی اور موزوں ہیں کہ ان کا سرے سے کوئی بدل ممکن ہی نہیں ہے۔ یعنی اگر یہ کوشش کی جائے کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا مجموعۂ قوانین یا انفرادی قانون ہی بدل دیا جائے یا موجودہ قانون / قوانین میں کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی / تحریف کی جائے تو یہ امر ناممکنات میں سے ہے۔

متذکرہ بالا دونوں آیات (سورۃ بنی اسرائیل:۷۷) اور (سورۃ الفتح:۲۳) کا اعادہ ایک ہی مقام سورۃ الفاطر میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾

"سو آپ اللہ کے دستور میں کبھی تبدیلی نہیں پائیں گے اور آپ اللہ کے قوانین کا کوئی متبادل (بھی) نہیں پائیں گے۔" (الفاطر:۴۳)

اس حقیقت کا اعادہ (سورۃ الاحزاب:۶۲) میں بھی کیا گیا ہے۔

قرآنی قوانین پوری نوع انسانی کے لئے ہیں

جہاں تک قرآنی اصول و قوانین کا تعلق ہے ان کے متعلق ایک اور اہم نکتہ یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ قرآن مجید کا خطاب پوری نوع انسانی سے ہے اور یہ کتاب بنیادی طور پر پوری نوع انسانی کے لئے مشعل ہدایت ہے۔ اس بنیاد پر اس کتاب میں جو قوانین بیان کئے گئے ہیں وہ انسانوں کی فلاح سے متعلق ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس میں بنیادی طور پر صحیح اور غلط راہ کی نشاندھی کی گئی ہے۔ ایسے افعال جن پر عمل کر کے دنیا اور آخرت کی فلاح حاصل ہو سکتی ہے، انہیں الگ بیان کر دیا گیا ہے اور اسی طرح ایسے کام جو دنیا اور آخرت کی تباہی اور ذلت کا باعث بنتے ہیں، انہیں بھی واضح طور پر بتا دیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر

جو قوانین بیان کئے گئے ہیں، ان کی نوعیت بڑی حد تک عمومی ہے۔ اس حوالے سے کچھ مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱- نہ تم کسی پر ظلم کروگے نہ تم پر ظلم ہو گا۔ (سورۃ البقرۃ:۲۷۹)

۲- ربا(سود) کھانے کا نتیجہ شکستگی، سست روی، اضمحلال اور مایوسی ہے۔ (سورۃ البقرۃ:۲۷۵)

۳- ربا(سود) سے حاصل ہونے والی آمدنی اذیت لاتی ہے۔(سورۃ البقرۃ:۲۷۵)

۴- نیکیاں بدیوں کو کھا جاتی ہیں۔(سورۃ ھود:۱۱۴)

۵- ناشکری کا نتیجہ تباہی ہے۔(سورۃ النحل:۱۱۲۔۱۱۳)

۶- تکبر کا نتیجہ فوری تباہی ہے۔(سورۃ حٰم السجدہ:۱۵۔۱۶)

۷- یہ کائنات برحق ہے۔ (سورۃ الانعام:۷۳)

۸- جنسی بے راہ روی کا انجام تباہی اور ذلت ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل:۳۲)

۹- معاشی مفادات کے پیچھے اندھا ہو جانے کا انجام سوائے ذلت کے اور کچھ نہیں۔
(سورۃ البقرہ:۶۵)

۱۰- ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ باعزت رزق ہے۔(سورۃ الحج:۵۰)

۱۱- انبیاء کرام کی تکذیب یا توہین کا نتیجہ بدترین عذاب ہے۔(سورۃ الشعراء:۱۳۹)وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام اصول یا اس سے ملتے جلتے دیگر اصول جو آگے بیان کئے گئے ہیں وہ عمومی نوعیت کے ہیں اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے نتائج فراہم کرتے ہیں۔ جہاں تک عام سماجی زندگی کا تعلق ہے قرآن مجید کے انہی قوانین کو بنیاد بنا کر انسان اپنی معاشرتی ضروریات کے لئے قانون سازی کر سکتے ہیں اور افراد انفرادی طور بھی پر ان سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر متذکرہ بالا اصولوں کو ہی اگر سامنے رکھا جائے تو قرآن مجید کا واضح اور دوٹوک قانون ہے کہ غیر مکتسب آمدنی (ایسی آمدنی جو انسانی محنت کے علاوہ کسی بھی دیگر ذریعے سے حاصل شدہ ہو قرآن مجید اس کے لئے ربا کی اصطلاح استعمال کرتا ہے) کے نتیجے میں طویل مدت میں شکستگی، پس مردگی، اضمحلال اور سست روی پیدا ہوتی ہے اور یہ آمدنی لازمی طور پر اذیت لے کر آتی ہے خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ (تفصیل کے لیے دیکھیئے میری کتاب "مروجہ اسلامی معاشی تصورات قرآنی تناظر میں") اب اس اصول کی

بنیاد پر ایک اسلامی ریاست میں کوئی قانون ایسا نہیں بن سکتا جس میں بلاواسطہ یا بالواسطہ، خفی یا جلی، کسی بھی حوالے سے سرمائے کا معاوضہ لیا جاسکتا ہو۔ اس طرح ایک طرف یہ قانون سازی کی اساس ہے تو دوسری طرف افراد کے لئے رہنمائی بھی۔

اس طرح ایک قانون یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنسی بے راہ روی خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو بدترین وبال لیکر آتی ہے۔ غور کیجئے یہاں بھی صورتحال وہی ہے۔ اس بنیاد پر حکومت کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ معاشرے میں ایسی قانون سازی کرے اور مختلف عملی اقدامات اٹھائے جن کے نتیجے میں عریانی، فحاشی اور جنسی بے راہ روی کی تمام اشکال کا ممکنہ حد تک قلع قمع ہوسکے تو دوسری طرف قرآن مجید نے نوع انسانی کو واضح طور پر بتادیا کہ اگر تم اس قسم کا طرز عمل اختیار کروگے تو اس کے نتیجے میں تم پر بدترین وبال نازل ہو گا۔

اسی طرح سے دیگر مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں جن پر آئندہ صفحات میں بلحاظ موضوع بحث کی گئی ہے۔

ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے نتائج

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ جو اصول اور قوانین قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں اگر ان پر عمل درآمد کیا جائے یا اگر اعراض کی راہ اختیار کرلی جائے تو کیا ہو گا؟

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اوّل الذکر صورت میں دنیا اور آخرت کی یقینی کامیابی ہے جبکہ ثانی الذکر شکل میں محض تباہی وبربادی جو دنیا اور آخرت دونوں پر محیط ہوتی ہے۔ جہاں تک قرآن مجید کے مکمل اتباع کے نتیجے میں دنیا اور آخرت میں مکمل کامیابی کا تعلق ہے اس نوید سے قرآن مجید کی کئی آیات منور ہیں۔ مثلاً:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْـــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ۵۵

"اللہ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور اعمال صالحہ کرنے والوں سے وعدہ کیا

ہے کہ وہ ان کو زمین میں تمکن عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو عطا کیا تھا اور جو دین اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے وہ ان کے لئے اسے مضبوطی سے قائم کردے گا اور ان کو حالت خوف سے حالت امن میں لے جائے گا، وہ میری عبادت کریں گے (اور) کسی کو بھی میرا شریک نہیں ٹھرائیں گے اور جو لوگ اس کے بعد بھی انکار کریں وہ نافرمانوں میں سے ہوں گے۔" (النور:۵۵)

صرف استخلاف فی الارض اور امن و سکون ہی نہیں بلکہ اس کا نتیجہ دنیا جہاں کی جملہ نعمتوں کے حصول کی شکل میں بھی نکلتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝

"اگر یہ لوگ تورات اور انجیل اور ان کی جانب جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ان کے پورے پابند رہتے تو یہ لوگ اپنے اوپر اور نیچے سے کھاتے۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے اعمال بُرے ہیں۔"

(سورۃ المائدہ:٦٦)

نہ صرف دنیاوی نعمتیں بلکہ اخروی انعام واکرام بھی۔ جنت میں اللہ تعالیٰ کی جو لاتعداد نعمتیں انہیں ملیں گی ان کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے ان مقامات میں سے محض چند کا تذکرہ مندرجہ ذیل ہے:

(i) ایک بہترین مقام اور آرام کی جگہ (سورۃ الفرقان:۲۴)، (ii) ٹھہرنے کی بہت اچھی جگہ (سورۃ الفرقان:۷۶)، (iii) عاقبت کا اچھا گھر (سورۃ الرعد:۲۴)، (iv) اونچے محل (سورۃ الفرقان:۷۵)، (v) وہاں سے جانا نہ چاہیں گے (سورۃ الکہف:۱۰۸)، (vi) بے بو نہروں کا پانی، دودھ جس کا مزا نہ بدلے، شہد مصفی، پاکیزہ شراب (سورۃ محمد:۱۵)، (vii) پاکیزہ دوست (سورۃ البقرہ:۲۵)، (viii) ہم عمر نوجوان عورتیں (سورۃ النباء:۲۳)، (ix) نہ دھوپ نہ سردی کی شدت (سورۃ الدھر:۱۳)، (x) گھنے سائے (سورۃ النساء:۵۷)، (xi) ایسے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں (سورۃ آل عمران:۱۹۵)، (xii) سونے کے تشت اور پیالے (سورۃ الزخرف:۷۱)، (xiii) بھرے ہوئے جام (سورۃ النباء:۳۴)، (xiv) جو

چاہیں گے ملے گا (سورۃ النحل:۳۱)، (xv) جو چاہیں گے ان کے رب کے پاس ہو گا (سورۃ الزمر:۳۴)، (xvi) جو چاہیں گے اس کے علاوہ کچھ اور زیادہ (سورۃ ق:۳۵)، (xvii) جس پھل کی خواہش ہو گی وہ ملے گا (سورۃ المرسلات:۴۲)، (xviii) ایسے پھل جو ہمیشہ رہیں گے (سورۃ الرعد:۳۵)، (xix) بہت سے میوے (سورۃ الزخرف:۷۳)، (xx) خوب اچھا رزق (سورۃ الطلاق:۱۱)، (xxi) سونے کے کنگن، موتی اور ریشمی کپڑے (سورۃ الحج:۲۳) اور اس کے علاوہ لاتعداد نعمتیں جن کا قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔

اللہ کے قوانین کی تکذیب یا ان سے انحرافات کے نتائج

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے قوانین کی تکذیب یا ان سے انحرافات کے نتائج کا تعلق ہے وہ ماسوا تباہی اور بربادی اور کچھ نہیں ہیں۔ اس امر کا اثبات مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

"لوگوں کی ہدایت کے لئے (تورات، انجیل اور دیگر کتب اتاریں) پھر قرآن (جو حق اور باطل کو الگ الگ کر دینے والا ہے) نازل کیا جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ اللہ غالب اور (مجرمین کو ان کے اعمال کا) بدلہ دینے والا ہے۔" (سورۃ آل عمران:۴)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ذو انتقام بیان کی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہاں انتقام سے مراد کسی بھی صورت میں، کسی بھی حوالے سے انسانی سطح کا انتقام نہیں ہے۔ یہاں اس صفت سے مراد مجرمین کو ان کے اعمال بد کی قانون مکافات عمل کے تحت سزا ہے۔ اس امر کا اثبات قوم فرعون کے حوالے سے (سورۃ الاعراف:۱۳۶) اور مجرمین کے متعلق ایک عمومی قانون کی صورت میں (سورۃ الحج:۳۲) سے بھی ہوتا ہے۔ یہ عذاب دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر محیط ہوتا ہے۔ دنیا میں یہ لوگ ایک خود کارانہ نظام کے تحت قانون مکافات عمل کی گرفت میں آتے چلے جاتے ہیں، ان پر ذلت و مسکنت طاری ہو جاتی ہے، ان کے

دلوں پر اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت مہر لگادی جاتی ہے جس سے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہو جاتے ہیں۔ مآل کار راہ مستقیم سے ہٹ کر کہیں بہت دور جہالت کے اندھیروں میں کھو جاتے ہیں۔ جہاں تک ان کے اخروی انجام کا تعلق ہے یہ بھی کم بھیانک نہیں ہوتا۔ ازروئے قرآن یہ لوگ روزِ قیامت اندھے اٹھیں گے، جب ان سے سوال جواب ہو گا تو ان کے پاس اپنے افعال کا کوئی جواب نہیں ہو گا۔ یہ مکمل طور پر خسارہ اٹھانے والے ہوں گے اور نتیجے کے طور پر جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان نکات کی مختصر اًوضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

دنیاوی نتائج

جہاں تک اس قسم کے طرز عمل کے دنیاوی نتائج کا تعلق ہے، ازروئے قرآن یہ لوگ ازخود قانون مکافات عمل کی گرفت میں آتے چلے جاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

"جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں ہم ان کو بتدریج (گرفت میں) لیے چلے جارہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر ہی نہیں اور (اللہ) ان کو مہلت دیتا ہے، بے شک میری تدبیر بہت مستحکم ہے۔" (سورۃ الاعراف: ۱۸۲۔۱۸۳)

ان آیات کریمہ میں لفظ نستدرج کا مادہ د، ر، ج ہے۔ اس کے معنی، بہت آہستہ آہستہ چلنا، کھسک کھسک کر چلنا کے ہیں۔ گویا ان آیات کریمہ کی رو سے اس قسم کے لوگوں کو قانون مکافات عمل ایک بہت سست اور غیر محسوس انداز میں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس طرح سے کہ خود اس قسم کے طرز عمل کا مظاہرہ کرنے والوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور جب وہ مکمل طور پر اس قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں تو اس قسم کے لوگوں پر بدترین ذلت و مسکنت مسلط ہو جاتی ہے اور وہ دنیا میں ذلت کی ایک عبرت ناک مثال بن جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے منجملہ جرائم میں سے ایک جرم اللہ تعالیٰ کے قوانین کی تکذیب اور ان سے انحراف بھی تھالہذا قانون مکافات عمل کے تحت ان پر بھی ذلت کی مار پڑی۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

"ان پر ہر جگہ ذلت کی مار پڑی الا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ یا لوگوں کی پناہ میں ہوں۔ یہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے ان پر مسکنت مسلط ہو گئی یہ اس لئے کہ یہ لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے تھے اور ناحق انبیاء کی توہین کیا کرتے تھے یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا۔" (سورۃ آل عمران:۱۱۲)

ان پر نہ صرف ذلت و مسکنت طاری ہو جاتی ہے بلکہ ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کے رخ بھی پھیر دیئے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جو نظر آنے والی سامنے برہنہ حقائق سے روگردانی کریں تو پھر ان کی فہم و بصیرت کا رخ موڑ دیا جاتا ہے اور انہیں سیدھی راہ پر آنے سے روک دیا جاتا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾

"یہ ہے تمہارا اللہ تم سب کا رب ہر شے کا خالق اس کے سوا کوئی رب نہیں پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو؟ اس طرح وہ لوگ بھی پھیر دیئے جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات (نشانیوں / احکامات) کا جانتے بوجھتے انکار کریں۔ (سورۃ المومن:۶۲۔۶۳)

ان آیات کریمہ میں رخ پھیر دیئے جانے کے لیے دو الفاظ تؤفکون اور یؤفک آئے ہیں، ان دونوں الفاظ کا مادہ ا، ف، ک ہے۔ اس کے معنی جھوٹ بولنے، جھوٹی بات بنانے، کسی شے کو الٹ دینے اور اس کا رخ پھیر دینے کے ہیں۔ رخ پھیر دینے کے حوالے سے یہ مادہ (سورۃ الاحقاف:۲۲)، (سورۃ المائدہ:۷۵) اور (سورۃ الذاریات:۹) میں بھی آیا ہے، اس حوالے سے سیدھا سادا اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے:

فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ

"جب وہ ٹیڑھے چلے تو اللہ نے بھی ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے۔" (سورۃ الصف:۵)

یعنی جب بھی کوئی شخص / قوم اس قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرے کہ وہ دیوار پر لکھے حقائق کو ماننے سے انکار کر دے اور جان بوجھ کر ایسا کرے تو پھر اس شخص / قوم کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت الٹ دی جاتی ہے یا اس کا رخ پھیر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی صورتحال ہوتی ہے جب انسان کا دل و دماغ دونوں حقائق کی گواہی دے رہے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اسے ماننے سے انکار کر دے تو اس کا نتیجہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کا اوندھا ہو جانا ہے۔ اس حوالے سے متذکرہ بالا آیات (سورۃ المؤمن: ۶۲۔۶۳) پر غور کیجئے دیکھیئے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ 'ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ'۔ یہ الفاظ ظاہر ہے ایسی ہستی کے لیے ہی کہے جاسکتے ہیں جو واضح طور پر سامنے نظر آرہی ہو۔ اس کے بعد یہ کہا گیا کہ اللہ ہی کائنات کی تمام اشیاء کا خالق ہے، یہ ایک ایسی بین حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن جو لوگ کھلے اور بین حقائق کا انکار کر دیں تو اس قسم کے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے اور یہ لوگ کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے مکمل طور پر معذور ہو جاتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝۳۵

"جو بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آئی ہو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں اللہ اور مومنین کے نزدیک جھگڑا ناپسند ہے اس طرح اللہ ہر متکبر اور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔" (سورۃ المؤمن:۳۵)

یہاں قلب پر مہر کے حوالے سے لفظ یطبع آیا ہے۔ اس کا مادہ ط، ب، ع ہے۔ اس مادہ کو تمثیلاً کسی شے کی انتہا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یا جہاں پہنچ کر کوئی چیز ختم ہو جائے یا پوری ہو جائے، پیمانے کے لبالب بھر جانے کو طبع کہا جاتا ہے۔ اس بنیاد پر الطبع سے مراد مہر لگا دینا ہے یعنی کسی شے کو بند کر دینا یا ڈھانپ دینا اور اس امر کا اطمینان کر لینا کہ اس میں کسی شے کا داخلہ ممکن نہ ہو۔ باالفاظِ دیگر کسی بھی فرد کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا مکمل خاتمہ۔ اس امر کی مزید تصدیق (سورۃ المنافقون:۳) اور (سورۃ البقرہ:۷) سے بھی ہوتی ہے جہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اللہ نے ان کے قلب پر مہر لگا دی ہے، اب یہ سوچ سمجھ نہیں سکیں گے۔ گویا جب کوئی شخص / قوم اللہ تعالیٰ کے واضح اور بین قوانین کا استرداد کرے اور اس ضمن میں تمام حدود پھلانگ جائے تو پھر ایسے افراد یا اقوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مکمل

طور پر ختم کر دی جاتی ہیں۔ اس پورے عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ مکمل طور پر گمراہ ہو کر ظلمات کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۳۹

"اور جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں اور ظلمات میں پڑے ہوئے ہیں اور جو چاہے وہ اللہ (قانون کے مطابق) ضلالت لے لے اور جو چاہے ہدایت لے لے۔" (سورۃ الانعام:۳۹)

اس آیت کریمہ کی رو سے ایسے لوگ جو اللہ کے قوانین کا انکار کرتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں یعنی نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔ یہ قلوب پر مہر کا نتیجہ ہے اور اس مہر کے نتیجے میں وہ ظلمات کے اندھیروں میں کھو جاتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا دنیاوی انجام ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے کھلے اور واضح قوانین کی تکذیب کرتے ہیں، انہیں ماننے سے انکار کرتے ہیں یا پھر ان سے انحرافات کرتے ہیں۔

اخروی انجام

جہاں تک ان لوگوں کے اخروی انجام کا تعلق ہے وہ بھی کم حسرت ناک نہیں۔ قرآن مجید میں اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کر دی گئی ہے از روئے قرآن اس قسم کے لوگ آخرت میں اندھے اٹھیں گے، جب ان سے سوال جواب کیئے جائیں گے تو ان کے پاس اپنے افعال کا کوئی جواز نہیں ہو گا۔ یہ چونکہ خاسرین میں سے ہوں گے لہذا جہنم ان کا ابدی ٹھکانہ بن جائے گی۔ ان نکات کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

ایسے لوگ جو اللہ تعالیٰ کے کھلے کھلے احکامات کی تکذیب کریں یا ان سے فرار حاصل کریں ایسے لوگ روزِ قیامت اندھے اٹھیں گے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝۱۲۴ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝۱۲۵ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝۱۲۶ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ

بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

"اور جو میرے ذکر سے روگردانی کرے گا اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی اور ہم روز قیامت اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب! تو مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا حالانکہ میں تو بصیرت کا حامل تھا (جواب ملے گا کہ) اسی طرح ہونا چاہئے تھا تو میری آیات کو بھول گیا تھا تو آج تجھے بھی بھلا دیا جاتا ہے۔ ہم ایسا ہی بدلہ ہر اس شخص کو دیتے ہیں جو حد سے گذرنے والا ہو اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے، بے شک آخرت کا عذاب سخت اور باقی رہنے والا ہے۔" (سورۃ طٰہٰ:۱۲۴۔۱۲۷)

آیات الٰہی کے منکرین کا مندرجہ بالا انجام مشیت خداوندی سے طے شدہ اس قانون کی مطابقت میں ہے جس کے تحت یہ طے کر دیا گیا ہے کہ جو دنیا کا اندھا ہو گا وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا بلکہ قطعی گم کردہ راہ۔ اس بین اصول کو سورۃ بنی اسرائیل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾

"اور جو شخص دنیا کی زندگی میں اندھا ہے وہ آخرت کی زندگی میں بھی اندھا ہو گا بلکہ راہ سے قطعی بھٹکا ہوا۔" (سورۃ بنی اسرائیل:۷۲)

گویا اس بین قرآنی اصول کے تحت ایسے لوگ جو دنیا میں اپنی بصارت و بصیرت کو استعمال نہ کریں اور مکمل اندھے بنے رہیں وہ قیامت میں بھی اندھے اٹھیں گے۔ جب انہوں نے اس دنیا میں اللہ کے احکامات سے آنکھیں بند رکھیں تو قیامت کے دن بھی انہیں آنکھیں کھولنے کا کوئی حق نہیں ہو گا۔

از روئے قرآن روزِ قیامت ایسے لوگ جو منکرین آیات ربانی ہیں انہیں ایک الگ گروہ کی شکل دے دی جائے گی اور جب ان سے ان کے دنیاوی طرزِ عمل کی بابت سوالات کیئے جائیں گے تو ان کے پاس اپنے ان افعال کا کوئی جواز نہیں ہو گا اور وہ کچھ بھی نہیں بول سکیں گے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ ۝ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُم بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِم بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنطِقُونَ ۝

"جس دن ہم ہر اُمت میں سے ان لوگوں کے گروہ کو جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے گھیر کر لائیں گے پھر وہ سب کے سب الگ کر دیئے جائیں گے۔ جب سب کے سب آ پہنچیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے میری آیات کو باوجود یہ کہ تم نے ان کا علمی لحاظ سے احاطہ نہیں کیا تھا کیوں جھٹلایا؟ اور یہ بھی بتاؤ کہ تم کیا کچھ کرتے رہے؟ بہ سبب اس کے کہ انہوں نے ظلم کیا تھا ان پر بات جم جائے گی اور وہ کچھ بھی بول نہیں سکیں گے۔" (سورۃ النمل:۸۳۔۸۵)

اس حوالے سے آیت کریمہ (سورۃ النمل:۸۴) کے دو الفاظ تحیطوا اور علما پر تدبر ضروری ہے۔ ان میں سے اول الذکر لفظ کا مادہ ح، و، ط ہے۔ اس کے بنیادی معنی حفاظت کرنا، محفوظ رکھنا، نگہبانی کرنا، مدافعت کرنا، کسی کی ضروریات کو پورا کرنا اور کسی شے کو گھیرے میں لینے کے ہیں۔ ثانی الذکر لفظ علما کا مادہ ع، ل، م ہے۔ اس کے معنی کسی شے کو کماحقہ جاننا، پہچاننا، حقیقت کا ادراک کرنا، یقین حاصل کرنا، محسوس کرنا، ٹھوس انداز میں کسی شے کو جاننے کے ہیں، پختہ علم والے شخص کو عالم کہا جاتا ہے۔ اس تناظر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ منکرین آیات ربانی کا طرز عمل در حقیقت کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ وہ ربانی دلائل یا احکامات و قوانین کا پوری طرح احاطہ کیئے بغیر یعنی ان کی بابت مکمل علم حاصل کیئے بغیر یا یوں کہہ لیجیئے کہ ان کی نوعیت و ماہیت کو جانے بغیر ان کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس طرح جزوی علم حاصل کر کے ربانی دلائل کا استرداد کر دیتے ہیں۔ روز قیامت ان سے ان کے اسی طرز عمل کی بابت پوچھا جائے گا تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکیں گے کیونکہ یہ طرز عمل بذاتِ خود ظلم ہے اور ظلم کا کبھی کوئی جواز نہیں ہوا کرتا لہذا وہ کوئی جواب بھی نہیں دے سکیں گے۔

از روئے قرآن ان کا یہ عمل اتنا برا ہے کہ اس کے نتیجے میں ان کے تمام دنیاوی اعمال ضائع ہو جائیں گے اور جب اعمال کا وزن ہو گا تو ان کے پاس اپنے اچھے اعمال کا سرے سے

کوئی میزان (Balance) نہیں ہو گا، کیونکہ مشیت ایزدی سے طے شدہ قانون کے مطابق ان کے اس قسم کے طرز عمل کی وجہ سے ان کے تمام تر اعمال ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کا شمار خاسرین میں ہو گا یعنی ایسے لوگ جن کے اعمال بد کا میزان ان کے اعمال صالحہ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتا ہے یا اعمال صالحہ سرے سے موجود ہی نہیں ہوتے نتیجے کے طور پر انہیں واصلِ جہنم کر دیا جائے گا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾

"کہہ دیجیے کہ اگر (تم کہو تو) میں تمہیں بتادوں کہ بہ اعتبار اعمال سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ ہیں کہ جن کی دنیاوی زندگی کی تمام تر کوششیں بے کار ہو گئیں اور وہ اسی گمان میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا اس لیے ان کے اعمال غارت ہو گئے پس قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہیں کریں گے، حال یہ ہے کہ ان کا بدلہ جہنم ہے کیونکہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا۔" (سورۃ الکہف: ۱۰۳۔۱۰۶)

ان لوگوں کے اس طرح خسارے میں رہ جانے کا تذکرہ (سورۃ الاعراف: ۹) اور (سورۃ الزمر: ۶۳) میں بھی کیا گیا ہے اور خاسرین کا ٹھکانہ ماسوا جہنم اور کچھ بھی نہیں ہے۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٠٥﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿١٠٦﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿١٠٧﴾ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿١٠٨﴾

"اور جن کے ترازو کا پلہ ہلکا ہو گیا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفوس کو خسارے میں ڈالا اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ان کے چہروں کو آگ جھلستی رہے

گی اور وہ وہاں بد شکل بنے ہوئے ہوں گے !(اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا) کیا میری آیات تمہارے سامنے تلاوت نہیں کی جاتی تھیں؟ پھر بھی تم انہیں جھٹلاتے تھے۔ وہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہماری بد بختی ہم پر غالب آگئی تھی اور ہم گمراہوں کی قوم میں سے تھے، اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نجات دے اگر اب بھی ہم ایسا کریں تو بے شک ہم ظالم ہیں اللہ تعالیٰ کہے گا پھٹکارے ہوئے وہیں پڑے رہو اور مجھ سے کلام مت کرو۔" (سورۃ المؤمنون:۱۰۸-۱۰۳)

ان آیات کریمہ سے جہاں اس حقیقت کا اثبات ہوتا ہے کہ عذاب جہنم دائمی ہے اور اس میں کسی رعایت یا واپسی کا کوئی تصور نہیں ہے تو دوسری طرف یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ ایسے لوگ جو اللہ تعالیٰ کی آیات یا اس کے احکامات کی پروا نہیں کرتے ان کے ساتھ در حقیقت مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا ان کے اعصاب پر مکمل طور پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ صرف اور صرف دنیا کے ہی ہو کر رہ جاتے ہیں اور اس سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو جاتے ہیں۔ اس امر کا اثبات متذکرہ آیات کریمہ کے دو الفاظ غلبت اور شقوتنا سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

لفظ غلبت کا مادہ غ، ل، ب ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں کسی کی گردن کے حصے کو مضبوطی سے گرفت میں لے لینا اسی سے غلبت کے معنی بالادستی، غلبے، قابض ہو جانے یا شکست دینے وغیرہ کے آتے ہیں۔ اسی طرح لفظ شقوتنا کا مادہ ش، ق، ق ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کو پھاڑنا، اس میں شگاف کرنا، پھٹ جانا، شیرازہ بکھیر دینا، باہمی اختلاف اور افتراق و انتشار کے ہیں۔ اس کے علاوہ قوت لگانا، محنت و سعی سے تھک جانا اور گراں گذرنا بھی اس کے معنوں میں شامل ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے نفسِ امارہ نے انہیں اپنی مکمل گرفت میں لے لیا تھا یا ان پر غلبہ پا لیا تھا اور نفسِ امارہ چونکہ برائیوں کی جانب ہی راغب کرتا ہے لہذا انہوں نے اس کے کہے میں آکر اتنے اعمال بدانجام دیئے کہ اس کے نتیجے میں ان کے نفس کا توازن بری طرح بکھر کر رہ گیا یا اس کا انہوں نے شیرازہ بکھیر دیا۔ اور اس عدم توازن کے نتیجے میں وہ اس حال کو پہنچ گئے۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ نفس کے توازن سے کیا مراد ہے اور ظلم

یا افعال بد سے اس کا شیرازہ کس طرح بکھر جاتا ہے اور یہ عدم توازن کس طرح انسانوں کو جہنم کا ایندھن بنادیتا ہے؟ اس پر مفصل بحث میری کتاب ''قرآن کا تصور نفس'' میں ملے گی۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے لوگ جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کی تکذیب کریں یا ان سے انحراف کریں وہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی جہنم کا ایندھن بنیں گے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعۡدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمۡ فِيۡهَا دَارُ الۡخُلۡدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۲۸﴾

''اللہ کے دشمنوں کی سزا یہی جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ ہماری آیات سے انکار کا بدلہ ہے۔'' (سورۃ حٰم السجدہ:۲۸)

جہاں تک اس قسم کے لوگوں کی دیگر سزاؤں کا تعلق ہے جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(i) انہیں اوندھے منہ جہنم کی طرف جمع کیا جائے گا (سورۃ الفرقان:۳۴)، (ii) انہیں اوندھے منہ کھینچا جائے گا (سورۃ بنی اسرائیل:۹۷)، (iii) انہیں اوندھے منہ آگ میں دھکیل دیا جائے گا (سورۃ النمل:۹۰)، (iv) چہرے سیاہ ہوں گے (سورۃ آل عمران:۱۰۶)، (v) چہرے خوف سے بگڑ جائیں گے (سورۃ الملک:۲۴)، (vi) اپنے چہروں اور پیٹھ پر آگ کو روک نہ سکیں گے (سورۃ لقمان:۳۹)، (vii) آگ ان کے چہروں کو جھلس دے گی (سورۃ المؤمنون:۱۰۴)، (viii) آگ کے کپڑے قطع کیئے جائیں گے (سورۃ الحج:۱۹)، (ix) اس سے نکل نہیں پائیں گے (سورۃ الحج:۲۲)، (x) کھانے کے ساتھ گرم پانی ہو گا (سورۃ الصافات:۶۷)، (x) کھولتا اور گرم پانی اور پیپ (سورۃ الواقعہ:۵۴)، (xi) کھولتا ہوا پانی جو آنتوں کو کاٹ دے گا (سورۃ محمد:۱۵)، (xi) سر پر کھولتا ہوا پانی (سورۃ الدخان:۴۸)، (xii) انکا کھانا زقوم کا درخت ہو گا (سورۃ الصافآت:۶۲)، (xiii) زقوم ہی کھائیں گے اسی سے پیٹ بھریں گے (سورۃ الواقعہ:۵۳)، (xiv) جلتی ہوئی آگ کا مزہ (سورۃ آل عمران:۱۸۱)، (xv) سلگائی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچتی ہے (سورۃ الھمزہ:۶۔۷)، (xvi) اوڑھنا، بچھونا دونوں آگ ہی کا ہو گا (سورۃ الاعراف:۴۱)، (xvii) پانی جو منہ کو بھون دے گا کھولتے ہوئے تانبے جیسا (سورۃ الکہف: ۲۹)، (xviii) پگھلا ہوا تانبہ جو پیٹ میں اس طرح کھولے گا جیسا کھولتا ہوا پانی (سورۃ الدخان:

۴۴-۴۶)،(xix) کھال آگ سے جل جائے گی تو بدل دی جائے گی تاکہ عذاب کا مزا چکھتے رہیں(سورۃ النساء:۵۶)اور دیگر کئی قسم کے عذاب۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات یا اس کتاب میں بیان کردہ اصولوں اور قوانین سے انحراف سے کس قسم کے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اقسام

اس حوالے سے جہاں تک ان قوانین کا تعلق ہے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اول قوانین امر اور دوم قوانین خلق۔ ان قوانین میں سے اول الذکر کو اس باب میں جبکہ ثانی الذکر کو اگلے باب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

قوانین امر

جہاں تک ان قوانین کا تعلق ہے جنہیں اس ذیل میں شمار کیا جاتا ہے انہیں سمجھنے سے پہلے لفظ امر کو سمجھنا ضروری ہے ۔

جہاں تک لفظ امر کا تعلق ہے اس کا مادہ ا،م، رہے۔ اس کے بنیادی معنی نشان، علامت، رہنمائی اور مشورہ کرنے کے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے معنی کوئی بات، معاملہ، حکم، برکت وغیرہ کے ہیں۔ جب اس کے معنی حکم کے ہوں تو اس کی جمع اوامر آتی ہے۔ جب اس کے معنی معاملہ، حادثہ، واقعہ یا حالت وغیرہ کے ہوں تو اس کی جمع امور آتی ہے۔ قرآن مجید میں اسے مختلف معنوں میں لایا گیا ہے۔ مثلاً مشاورت کے لیے (سورۃ الاعراف:۱۱۰)،(سورۃ الشعراء:۳۵)،(سورۃ الطلاق:۶)،(سورۃ القصص:۲۰)وغیرہ، حکم کے معنوں میں (سورۃ بنی اسرائیل:۱۶)، اور (سورۃ البقرہ:۶۷)، اجتماعی معاملے کے لیے (سورۃ النور:۶۲)، فیصلہ کن مرحلے کے لیے (سورۃ النحل:۳۲)،ناپسندیدہ بات کے حوالے سے (سورۃ الکہف:۷۱)، رائے، مرض یا خواہش کے ضمن میں (سورۃ الکہف:۸۲) میں آیا ہے۔

مندرجہ بالا معنوں کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں یہ لفظ اس مرحلے کے لیے بھی آیا ہے جسے خلق سے پہلے کا مرحلہ یا تدبیری مرحلہ یا مرحلہ قبل از خلق کہا جا سکتا ہے۔ بالالفاظ دیگر یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب اللہ اپنی مشیت سے کسی تخلیق کی بابت فیصلہ کرتا ہے۔

إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٣٥﴾

"جب وہ ایک امر کا فیصلہ کرلیتا ہے تو (اس امر کو) کہتا ہے ہو جا! تو وہ ہو جاتا ہے۔" (سورۃ المریم:۳۵)

انسان اللہ تعالیٰ کی ذات کی نوعیت وماہیت کی بابت ظاہر ہے کچھ بھی نہیں جانتا لہذا اللہ تعالیٰ کی بابت یہ کہنا کہ وہ یہ فیصلہ کس طرح کرتا ہے کسی صورت ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اس حوالے سے قرآن مجید میں کوئی اشارہ دیا ہے لہذا اس بابت کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ماسوا اس کے کہ جیسا کہ متذکرہ بالا آیت کے الفاظ میں کہا گیا کہ وہ محض حکم دیتا ہے اور وہ امر یا شے یا واقعہ یا اللہ کا حکم عملی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ یہاں بہر حال زمان و مکان کے خدائی پیمانوں اور اس کی مخلوقات بالخصوص انسانوں کے پیمانوں میں جو فرق ہے اسے بہر حال ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ یہاں یہ امر بھی بہر حال لازمی طور پر ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ خود زمان و مکان کا کسی صورت پابند نہیں ہے وہ تو خود ان کا خالق ہے۔ خالق مخلوق کا پابند کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ لہذا جب متذکرہ بالا آیت (سورۃ المریم:۳۵) میں یہ کہا گیا کہ اللہ جونہی کسی امر کا حکم دیتا ہے تو وہ امر اسی وقت وقوع پذیر ہو جاتا ہے تو یہ صورتحال یقیناً اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ہے کیونکہ وہ تو وقت سے وَراء الوراء ہے۔ لیکن مخلوقات کے حوالے سے بہر حال ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے حوالے سے وہ امر زمانے کے مختلف پیمانے مثلاً لمحے، گھنٹہ، دن، ہفتہ، مہینہ، سال، صدیوں یا قرنوں کے حوالے سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت مندرجہ ذیل آیت کریمہ کے حوالے سے کی جاسکتی ہے:

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿٥﴾ ذَٰلِكَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٦﴾

"وہ آسمان سے لیکر زمین تک (ہر) امر کی تدبیر کرتا ہے (پھر وہ امر) اس کی طرف ایک ایسے دن میں لوٹتا ہے جس کی مقدار تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال کے برابر ہے، اللہ ہر ظاہر اور پوشیدہ شے کو جاننے والا، غالب اور رحمت والا ہے۔" (سورۃ السجدۃ:۵-۶)

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ تمام تر امور اللہ تعالیٰ کی ہی جانب لوٹتے ہیں

تاہم ان کے پیمانے انسانی اعتبار سے پچاس ہزار سال پر محیط ہوتے ہیں تاہم ایک دوسرے مقام پر اسے ہزار سال بھی کہا گیا ہے۔ (سورۃ المعارج:۴)

یہ صورتحال بذاتِ خود زمان و مکان کے حوالے سے گہرے غور و خوض اور تدبر کی متقاضی ہے۔ تاہم یہ پہلو چونکہ کتاب کے موضوع سے مطابقت میں نہیں لہذا فی الحال اس سے صرف نظر کیا جارہا ہے۔ جہاں تک حالتِ امر کا تعلق ہے وہاں اللہ تعالیٰ جس شے کو بھی خلق کرنا چاہتا ہے پہلے اس کا صحیح مقام متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، پھر اس کے حوالے سے اصول و قوانین متعین کرتا ہے پھر اسے مکمل، کامل اور بالحق انداز میں وجود میں لے آتا ہے۔ از روئے قرآن اللہ تعالیٰ اپنی ہر تخلیق سے پہلے چونکہ یہ تینوں افعال انجام دیتا ہے اور یہ اس کی سنت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی لہذا ان تینوں افعال کو تین الگ الگ قوانین کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ یہ تینوں قوانین بالترتیب قانون تدبیری (ہر کام میں حکمت)، قانون خلق و پیدائش (شے کی تخلیق اور قوانین تخلیق) اور قانون ہدایت (ہر شے کی تقدیرات کا تعین) ہیں۔ ان قوانین کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

۱- قانونِ تدبیری / قانونِ حکمت

اس قانون کو سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی تمام تخلیقات کے پیچھے ایک حکمت ہوتی ہے۔" جہاں تک لفظ حکمت کا تعلق ہے اس کا مادہ ح، ک، م ہے۔ اس کے معنوں میں دانائی، بصیرت، دانش مندی، استواری، استحکام، کسی برائی سے روکنا، فیصلہ، رائے، حکومت، مضبوط اور متعین وغیرہ شامل ہیں۔ الحکیم، اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ اس سے مراد ایک ایسی ہستی ہے جس کا ہر ہر فعل نہ صرف یہ کہ دانائی، عقل و بصیرت پر مبنی ہو بلکہ اس کے تمام افعال مضبوط، مستحکم، متعین اور حکمت پر مبنی ہوں۔ یہ تمام افعال اپنی تمام تر وسعت و جامعیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات میں مجتمع ہیں لہذا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت جیسا کہ عرض کیا گیا الحکیم بھی ہے۔

اس مادہ کے دیگر معنی روکنے اور منع کرنے کے بھی ہیں باالفاظ دیگر کسی امر کا واضح اور متعین انداز میں تعین کر دینا بھی اس کے معنوں میں شامل ہے یعنی کسی بھی حوالے سے حقوق و واجبات کا تعین کر دینا اور اس سے آگے بڑھنے نہ دینا اسی کو حکم کہتے ہیں یعنی فیصلہ

کر دینا نہ صرف فیصلہ بلکہ ایسا فیصلہ جو عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ اس بنیاد پر الحکیم سے مراد ایسی ہستی بھی ہے جو ہر فعل کو اس کے صحیح تناسب و توازن کے ساتھ، اس کے منجملہ تمام تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انجام دے۔ حکمت کو حکمت اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ اس کی مدد سے کسی بھی شے کو اس کے متعین مقام پر رکھا جاتا ہے اور اس کو حدود فراموشی سے روک دیا جاتا ہے۔ یہی حکمت کا پہلو ہے جس چیز کو کسی مقام پر روک دیا جائے تو وہ وہاں استوار یا مستحکم ہو جاتی ہے۔ اللہ کی ذات ان معنوں میں بھی حکیم ہے کہ وہ تمام اشیاء کو پہلے ان کا مقام بتاتا ہے اور پھر انہیں ان کی حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ اللہ ہی تمام اختلافات کا صحیح، مبنی بر انصاف اور بر حق فیصلے کرتا ہے۔

اس پس منظر میں یہ کہا جاسکتا ہے اللہ تعالیٰ کی منجملہ تمام تخلیقات جنہیں وہ اپنی مشیت سے پیدا کرتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ مبنی بر حکمت ہوتی ہیں بلکہ جس چیز کو جہاں پیدا کیا جاتا ہے وہ اپنی جگہ مستحکم و استوار ہوتی ہے اور اللہ ہی وہ ہستی ہے جو انہیں ان کی حدود میں رکھتا ہے۔ اس کائنات کا تمام تر انتظام و انصرام مکمل حکمت کے ساتھ صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

"بے شک تمہارے رب نے زمین اور آسمانوں کو چھ ادوار میں پیدا کیا ہے پھر (اس کائنات) کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیا وہی (اس کائنات کا) انتظام چلا رہا ہے اس کی اجازت سے ماسوا کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب سو اسی کی اطاعت اختیار کرو کیا! تم پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے؟"

(سورۃ یونس:۳)

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ یہ پوری کائنات تخلیق کی بلکہ اس کا پورا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے بلکہ اس کائنات کی جملہ مخلوقات کو رزق کی فراہمی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ

فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

"آپ کہہ دیجئے کہ وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے یا وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں پر مکمل اختیار رکھتا ہے؟ وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ وہ کون ہے جو تمام امور کی تدبیر کرتا ہے؟ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ۔ تو ان سے کہیئے کہ پھر وہ اس سے ڈرتے کیوں نہیں؟ (سورۃ یونس:۳۱)

باالفاظِ دیگر اس پوری کائنات کی ماقبل تخلیق اور مابعد تخلیق کے منجملہ تمام امور کی ذمے داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اور یہ کائنات بلکہ اس کی تمام تر اشیاء اپنی اپنی جگہ پر مکمل حکمت ودانائی کی مظہر ہیں۔ اس کا سادہ سا ثبوت اس پوری کائنات کا ربط باہم ہے۔ اس کائنات کی تمام تر اشیاء غیر معمولی ربط کے ساتھ ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور کسی بھی صورت میں، کسی بھی جگہ، کسی بھی غلط انسانی فعل کے نتیجے میں پیدا ہونے والا عدم توازن دیگر متعدد معاملات کے توازن کو درھم برھم کر دیتا ہے۔

اس امر کی تصدیق کہ یہ کائنات کسی بھی حوالے سے بے مقصد نہیں۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے بخوبی ہوتی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

"آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے اس کائنات کو (ہرگز) باطل تخلیق نہیں کیا۔ تمام تعریف اللہ کے لیے ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔"

(سورۃ آل عمران:۱۹۱-۱۹۰)

یہ آیات کریمہ اس امر پر شاہد ہیں کہ یہ کائنات بے مقصد یا عبث پیدا نہیں کی گئی ہے

اس کی ایک حکمت ہے، ایک مقصد ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی جدید سائنس قدم قدم پر گواہی دیتی ہے۔ جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے اس کی صراحت بھی قرآن مجید نے کر دی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت، اس مقصد پر آگے الگ سے بحث کی گئی ہے۔

یہاں یہ امر خاص دلچسپی کا سبب ہے کہ قرآن مجید میں اللہ کی ذات و صفات کے لیے استدلالی یا منطقی ثبوت نہیں دیا گیا کیونکہ سامع نے پہلے ہی ایک جھوٹا خدا استدلالی یا منطقی ثبوت کے بغیر مان رکھا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی جانب سے مظاہر فطرت پر غور و فکر کی دعوت دینے کا مقصد یہ ہے کہ ان مظاہر فطرت پر تدبر کر کے انسان یہ دیکھے کہ آیا یہ مظاہر کسی جھوٹے خدا کی صفات کے ساتھ کوئی علمی یا عقلی مناسبت رکھتے ہیں یا اس سچے خدا کی طرف جس کی طرف قرآن مجید دعوت دیتا ہے۔

اس حقیقت کا اعادہ ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝۲۷

"ہم نے ارض و سماوات کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے یونہی باطل نہیں پیدا کر دیا۔ یہ تو ان لوگوں کا ظن ہے جو کفر کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جہنم کی آگ ہے۔" (سورۃ ص:۲۷)

یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں۔

وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝۹

"اگر ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ اسے ایک غالب مقتدر اور حکیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔" (سورۃ الزخرف:9)

گویا کائنات کا مبنی بر حکمت ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔

۲۔ قانون خلق و پیدائش

جہاں تک لفظ خلق کا تعلق ہے اس کا مادہ خ، ل، ق ہے۔ اس کے معنی کسی شے کو بنانے یا کاٹنے کے لیے اسے ناپنے یا اس کا اندازہ لگانے کے ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کے تناسب و

توازن کو دیکھنا، کسی شے کو نرم وہموار کرنا، ایک چیز کو کسی دوسری شے سے بنانا، کسی شے کا (استعمال کے بعد) ہموار، صاف اور چکنا ہو جانا کے ہیں، اس کے علاوہ اس کے معنی مختلف عناصر کو نئی نئی تراکیب یا تبدیلیوں یا اضافوں کے ساتھ ترقی دینا، ان سے نئی اشیاء کی پیدائش بھی شامل ہے۔ خلق کے معنی رسم ورواج اور عادت کے بھی ہیں۔ اس بنیاد پر خلاق کے معنی اس فضیلت کے ہیں جو حسن اخلاق کی بنا پر حاصل ہو۔ اسی حوالے سے آنحضرت (ﷺ) کے لیے قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ آپ اخلاق کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہیں۔ (سورۃ القلم:۴) خلق کے معنوں میں اعتدال، تناسب و توازن اور عدل بھی شامل ہیں۔

جہاں تک قانون خلق کا تعلق ہے اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق ہے اور یہ کائنات برحق اور کامل ہے۔"

اس قانون کے بنیادی طور پر تین حصے ہیں۔ اول یہ کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے، دوم کائنات برحق ہے اور سوم یہ اپنی نوعیت و ساخت میں کامل ہے۔ ان تینوں اجزاء کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

(الف) اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق ہے

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے اسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ۝۵

"تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اندھیرے اور روشنی کو بنایا ہے۔" (سورۃ الانعام:۱)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے:

وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ

"اگر ان سے پوچھا جائے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ اللہ نے۔" (سورۃ الزمر:۳۸)

اس حقیقت کا اعادہ (سورۃ العنکبوت:۶۱) میں بھی کیا گیا ہے۔ کسی بھی دوسرے جھوٹے خدا نے کبھی بھی، کسی بھی وقت ایک ذرہ تک تخلیق نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اس قسم کے جھوٹے دعوے داروں سے پوچھتا ہے کہ اگر اس کائنات کا، کہیں بھی کوئی

دوسرا خالق ہے تو اس نے کونسی شے تخلیق کی ہے؟

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۱

"یہ سب اللہ کی تخلیق ہے لیکن مجھے بتاؤ کہ اس کے سوا (جنہیں تم خدا سمجھتے ہو) انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ نہیں یہ ظالم لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔"

(سورۃ القمان:۱۱)

گویا اس امر کا دعویٰ کرنا یا عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی اس کائنات کا یا اس کے کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے حصے کا خالق ہے یا وہ کائنات کے کسی بھی معاملے میں دخیل ہے ازروئے قرآن کھلی کھلی گمراہی ہے۔

(ب) کائنات برحق ہے

یہ کائنات نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے بلکہ قطعی برحق پیدا کی گئی ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۤئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝۸

"کیا یہ لوگ خود اپنے نفوس میں غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے ارض و سماوات کو اور جو کچھ ان کے اندر ہے ماسوا حق پیدا نہیں کیا اور ایک مقررہ عرصے کے لیے (اس کی تخلیق کی گئی ہے) اور واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت اپنے رب کے سامنے پیش ہونے کی منکر ہے۔" (سورۃ الروم:۸)

جہاں تک اس حوالے سے لفظ حق کا تعلق ہے اس کا مادہ ح، ق، ق ہے۔ اس کے معنی کسی شے کے اس طرح وجود میں آنے کے ہیں کہ اس کے وقوع یا وجود سے کسی صورت انکار ممکن نہ ہو یعنی کسی شے کا ناقابل تردید ثبوت یا اثبات جس میں صحت، اثبات اور استحکام شامل ہو۔ اس طرح وجود میں آنے والی شے نہ صرف یہ کہ معروضی وجود کی حامل ہو بلکہ ثابت شدہ، یقینی اور مبنی بر انصاف اور قرین مصلحت و حکمت ہو۔ دوسری طرف یہ شے تعمیری نتائج کی حامل ہو اور اس کے ساتھ ساتھ علم و عقل، عدل و انصاف کے بھی عین مطابق ہو۔ باالفاظِ دیگر حق کوئی نظری یا ذہنی یا تصوراتی یا محض عقیدہ نام کی شے نہیں ہوتی بلکہ

اس قسم کی شے ہوتی ہے جو اپنی دلیل آپ ہو اور اپنی صداقت یا سچائی کے لیے کسی خارجی دلیل کی محتاج نہ ہو اور خود اپنا ثبوت آپ ہو یعنی آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

اس بنیاد پر جب یہ کہا جاتا ہے کہ کائنات برحق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات خود اپنی دلیل آپ ہے اور اپنے اثبات کے لیے کسی خارجی سہارے کی محتاج نہیں ہے۔ یہ امر بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کی آیات یا نشانیوں میں سے ایک بہت بڑی اور ٹھوس شہادت ہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۴﴾

"اللہ نے زمین اور آسمان کو برحق پیدا کیا ہے یقیناً اس میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔" (سورۃ العنکبوت:۴۴)

اس حقیقت کا اعادہ (سورۃ الزمر:۵)، (سورۃ الدخان:۳۸۔۴۰) میں بھی کیا گیا ہے کہ یہ کوئی محض ہنسی مذاق کی شے نہیں ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ﴿۱۶﴾

"اور ہم نے زمین اور آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کو محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔" (سورۃ الانبیاء:۱۶)

(ج) یہ کائنات اپنی ساخت میں مکمل ہے

یہ کائنات اپنی ساخت میں مکمل اور جامع ہے جس میں کہیں کسی قسم کا جھول یا خامی یا کمی نہیں ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ﴿۴﴾

"اس نے کئی آسمان اوپر تلے بنائے، (اے ناظر!) کیا تو (خدائے) رحمان کی آفرینش میں کوئی نقص دیکھتا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ تجھے کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ (سہ بارہ) نظر کر! (تیری) نظر (ہر بار) تمہارے پاس ناکام و نامراد لوٹ آئے گی۔" (سورۃ الملک:۳-۴)

باالفاظِ دیگر اس کائنات میں کہیں کسی قسم کی کوئی خامی نہیں ہے۔ یہ ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے جس میں کسی قسم کے کسی رخنے کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

کائنات میں مختلف مخلوقات کے خلق کے حوالے سے قوانین

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کائنات میں مختلف مخلوقات کی تخلیق کا تعلق ہے اس حوالے سے بھی قرآن مجید میں متعدد قوانین بیان کیئے گئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

i۔ ارتقائی تخلیق

تخلیق کے اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ جو بھی مخلوقات خلق کرتا ہے انہیں براہ راست حتمی شکل نہیں دیتا بلکہ یہ تمام تر مخلوقات جن میں ظاہر ہے انسان بھی شامل ہے مختلف ارتقائی مراحل سے گذر کر اپنی حتمی شکل تک پہنچتی ہیں۔ اس حقیقت کا اثبات مندرجہ ذیل آیات قرآنی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

"وہ آسمان سے لیکر زمین تک (ہر) امر کی تدبیر کرتا ہے (پھر وہ امر) اس کی طرف ایک ایسے دن میں لوٹتا ہے جس کی مقدار تمہاری گنتی کے ایک ہزار سال کے برابر ہے، اللہ ہر ظاہر اور پوشیدہ شے کو جاننے والا غالب اور رحمت والا ہے۔"

(سورۃ السجدۃ:۵-۶)

اس بات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے منجملہ تمام امور اپنی حتمی شکل میں اللہ ہی کی جانب لوٹتے ہیں لیکن یہ امور مختلف ارتقائی مراحل میں ہی تکمیل پاتے ہیں۔ بصورت دیگر اگر کوئی امر ابتدا ہی سے مکمل ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کی جانب لوٹنے میں ظاہر ہے اتنا طویل عرصہ نہیں لگ سکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنے مختلف امور کو بالکل خام شکل سے شروع کرتا ہے پھر انہیں بتدریج مختلف ارتقائی مراحل سے گذار کر ایک مکمل اور کامل شکل دیتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو ظاہر و باطن کا مکمل علم ہے اور وہ مکمل غلبہ رکھنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یعنی اسے ان تمام امور کا کامل علم ہے جو ابھی پردہ غیب میں ہیں اور جو ظاہر ہو چکے ہیں

اور اللہ تعالیٰ ان سب پر مکمل غلبہ رکھنے والا اور ساتھ ساتھ اپنی مخلوقات پر رحم کرنے والا بھی ہے۔ اس حقیقت کا اثبات کہ متذکرہ بالا آیات (سورۃ السجدہ:۵۔۶) میں امور کی مدت سے مراد ان کی تکمیل کے ارتقائی مراحل ہی ہیں، اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ان دونوں آیات کے فوراً بعد ان سے متصل اگلی تین آیات یعنی (سورۃ السجدہ:۷۔۹) میں نوع انسانی کی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر کیا گیا ہے۔

جہاں تک نوع انسانی کی تخلیق کے مختلف ارتقائی مراحل کا تعلق ہے ان پر مفصل بحث میری کتاب 'ارتقاء حیات از روئے قرآن' میں کی گئی ہے تاہم ان کا بالکل اجمالی بیان مندرجہ ذیل ہے۔

انسان کے متعلق کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مختلف ارتقائی مراحل میں تخلیق کیا ہے:

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾

"اور اللہ نے تمہیں مختلف مراحل میں خلق کیا ہے۔" (سورۃ نوح:۱۴)

اس حوالے سے مختلف ارتقائی مراحل کا قرآن مجید میں مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے۔ از روئے قرآن انسان کی تخلیق نفس واحد سے ہوئی پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا:

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا

"اس نے تم کو نفسِ واحد سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔"

(سورۃ الزمر:۶)

اس کی تخلیق پانی سے ہوئی:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ

"اور اللہ وہ ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا۔" (سورۃ الفرقان:۵۴)

اس کی ابتدا مٹی سے ہوئی:

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷﴾

"اور انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔" (سورۃ السجدہ:۷)

اگلے مرحلے میں اس نے پودے کی شکل اختیار کی:

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ﴿۱۷﴾

"اور اللہ ہی نے تم کو نباتات کی طرح اگایا۔" (سورۃ نوح:۱۷)

اگلا مرحلہ درجہ حیوانیت تھا:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ

"اور اللہ ہی نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے تم کو جوڑا جوڑا بنایا۔"

(سورۃ فاطر:۱۱)

اس کے بعد اسے درجہ حیوانیت سے انسانی سطح عطا ہوئی اس طرح سے کہ اللہ نے اس کے شعور کی سطح بلند کر دی:

الَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۚ﴿۷﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۚ﴿۸﴾ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۹﴾

"جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا پھر اس کی نسل حقیر پانی سے پیدا کی پھر اس کو درست کیا پھر اس کے شعور کی سطح بلند کی اور تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے (مگر) تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔" (سورۃ السجدہ:۷-۹)

ان آیات کریمہ سے واضح ہے کہ انسان کی تخلیق مختلف ارتقائی مراحل سے گذر کر ہوئی۔ نہ صرف انسان بلکہ اس کائنات کی تمام اشیاء بھی اسی طرح تخلیق کے مختلف مراحل سے گذر کر اپنی حتمی شکل تک پہنچی ہیں۔

ii۔ تخلیق بذریعہ آب

تخلیق کے اس قانون کے تحت ہر جاندار کی تخلیق پانی کی مدد سے ہوتی ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ

"اور ہم نے پانی سے ہر زندہ شے کو پیدا کیا۔" (سورۃ الانبیاء:۳۰)

اس حقیقت کا اعادہ ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ

"اور اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔" (سورۃ النور:۴۵)

iii۔ جوڑوں کی شکل میں تخلیق

تخلیق کے اس قانون کے تحت دنیا کی ہر شے کی تخلیق جوڑوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس قانون کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ۝

"پاک ہے وہ ذات جس نے ہر قسم کے جوڑے پیدا کیئے اس میں سے بھی جس کو زمین اگاتی ہے اور خود ان کے نفوس میں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے۔" (سورۃ یٰسٓ:۳۶)

اس حقیقت کا اعادہ ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۝۱۱

"وہ آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ اس نے تمہارے نفوس میں جوڑے بنائے اور چوپائیوں کے جوڑے وہ تمہیں اس دنیا میں پھیلاتا ہے اس کی مثل کوئی شے نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔" (سورۃ الشوریٰ: ۱۱)

آیت کے الفاظ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا "تمہارے نفوس میں جوڑے" اس امر کی صریح شہادت ہیں کہ ہر انسانی شخصیت جوڑوں کی شکل میں ہے۔ نہ صرف متذکرہ بالا آیات بلکہ اس حوالے سے قرآن مجید سے کئی آیات کے حوالے دیئے جاسکتے ہیں جہاں انسانوں کے حوالے سے اس تفریق کو واضح طور پر روار کھا گیا ہے۔ اور نہ صرف انسان بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق جوڑوں کی شکل میں ہوتی ہے جیسا کہ متذکرہ بالا آیات (سورۃ یٰسٓ:۳۶) میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

۳۔ قانون ہدایت / قانون تقدیری

قوانین امر میں سے تیسرا قانون، قانون ہدایت ہے اس قانون کے تحت "اللہ تعالیٰ اپنی پیدا کردہ منجملہ تمام مخلوقات کو نہ صرف یہ کہ پیدا کرتا ہے، انہیں ایک مخصوص ساخت عطا کرتا ہے بلکہ انہیں ہدایت بھی دیتا کرتا ہے۔"

یہاں یہ ضروری ہے کہ لفظ ہدایت پر تدبر کیا جائے۔ اس لفظ کا مادہ ہ، د، ی ہے۔ اس کے بنیادی معنی روشن ہونے، نمایاں ہونے، آگے آگے ہونے، دوسروں کے آگے آگے چلنے، راستہ بتانے اور ہدیہ یا تحفہ بھیجنے کے ہیں۔ ہدیہ سے مراد وہ تحفہ ہوتا ہے جو بغیر کسی معاوضے کے دیا جائے۔ ھَدیٰ کے معنی واضح کرنا اور رہنمائی کرنا کے ہیں۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو تخلیق کرتا ہے تو اسے اس کے فرائض کی بابت مکمل اور جامع رہنمائی بھی عطا کرتا ہے۔ یہ تمام تر مخلوقات صرف اور صرف وہی فرائض ادا کرتی ہیں جو انہیں تفویض کیئے جاتے ہیں۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝

"(فرعون نے) کہا! تم دونوں کا رب کون ہے؟ اے موسیٰ! (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے اپنی خلق کردہ ہر شے کو (ساخت) عطا کی اور پھر اسے ہدایت دی۔" (سورۃ طٰہٰ:۴۹-۵۰)

یعنی اللہ تعالیٰ پہلے اپنی تخلیق کردہ منجملہ تمام اشیاء کو ایک مخصوص ساخت عطا کرتا ہے۔ یہ ساخت لازمی طور پر متوازن ہوتی ہے اور پھر اپنی تمام مخلوقات کو ہدایت عطا کرتا ہے۔ یہاں ہدایت سے مراد ان اشیاء کے فرائض و افعال کے بارے میں مکمل اور جامع رہنمائی ہے۔ اس طرح تمام اشیاء چند مخصوص تقدیرات کی پابند ہو جاتی ہیں اور پھر وہ اپنے لیے متعین کردہ تقدیرات (قوانین) کے مطابق ہی عمل کرتی ہیں اور اس سے سرِ مو انحراف نہیں کرتیں۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝

"بے شک ہم نے ہر شے کو ایک طے شدہ پیمانے / قاعدے / قانون کے مطابق پیدا کیا۔" (سورۃ القمر:۴۹)

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ان قوانین / تقدیرات کا تعلق ہے جو مختلف اشیاء کے لیے مشیت ایزدی کی جانب سے طے کر دی جاتی ہیں یہ تقدیرات کبھی، کسی صورت میں، کسی بھی حوالے سے تبدیل نہیں ہوتیں۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلُ ۖۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا ﴿۲۳﴾

"اللہ تعالیٰ کی (یہی) سنت ہے جو ہمیشہ سے چلی آئی ہے اور تم کبھی اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں پاؤ گے۔" (سورۃ الفتح:۲۳)

اس حقیقت کا اعادہ ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِیۡلًا ﴿۴۳﴾

"اور تم کبھی اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں پاؤ گے اور نہ کبھی تم اللہ کی سنت کو تحویل ہوتا ہوا پاؤ گے۔" (سورۃ فاطر:۴۳)

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اِن قوائد / قوانین / تقدیرات کا تعلق ہے یہ انسانوں اور خارجی کائنات پر یکساں منطبق ہوتی ہیں۔ جس طرح یہ تقدیرات یا قوانین طبیعی دنیا میں کسی صورت تبدیل نہیں ہوتے اسی طرح انسانوں کے طرز عمل کے متعلق تقدیرات یا قوانین بھی ناقابل تبدیل اور مکمل طور پر اٹل ہیں۔ جہاں تک طبیعی دنیا کا تعلق ہے اس دعوے کا سادہ سا ثبوت تو خود سائنس ہے جس کا بنیادی مفروضہ ہی یہ ہے کہ طبیعی قوانین اس پوری کائنات میں قطعی یکساں ہیں یعنی اگر کوئی سائنسی حقیقت یا قانون اس زمین پر درست ہے تو وہ حقیقت یا قانون، کائنات کے بعید ترین کونے پر بھی ویسا ہی ہو گا اور اس میں کوئی تبدیلی یا انحراف ممکن نہیں، بشرطیکہ بنیادی مفروضات میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ ظاہر ہے یہی صورتحال انسانی دنیا میں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے انسانوں کے لیے جو قوانین متعین کر دیئے ہیں ان میں بھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

اس حوالے سے جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے بدیہی طور پر یہاں رہنمائی سے مراد ان اصولوں اور قوانین یا معیارات کی نشاندہی ہے جن کی بنیاد پر زندگی گذاری جانی چاہیے یا جو زندگی کے جملہ معاملات میں رہنمائی فراہم کر سکیں اور جن کی مدد سے انسان دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ با الفاظ دیگر یہ اس راہ کی جانب نشاندہی ہے جو فوز و

فلاح کی راہ ہے۔ یہاں کامیابی اور فوز و فلاح سے مراد اس دنیا میں ہر طرح کی کامیابی ہے جو مال و دولت میں اضافے سے لیکر فکری اور سیاسی برتری تک محیط ہے۔ نہ صرف اس دنیا میں بلکہ اخروی حیات میں سرخروئی بھی اس میں شامل ہے بلکہ در حقیقت اصل اور بنیادی کامیابی تو اخروی نجات و فلاح ہی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۵

"اللہ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور اعمال صالحہ کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں تمکن عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو عطا کیا تھا اور جو دین اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے وہ ان کے لیے اسے مضبوطی سے قائم کردے گا اور ان کی حالت خوف کے بعد حالت کو امن میں تبدیل کردے گا، وہ میری عبادت کریں گے (اور) کسی کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو لوگ اس کے بعد بھی انکار کریں وہ نافرمانوں میں سے ہوں گے۔ (سورۃ النور:۵۵)

یہاں یہ امر قطعی طور پر ذہن میں رہے کہ اس قسم کی ہدایت کسی بھی صورت میں عقل فراہم نہیں کرسکتی۔ حقیقی ہدایت صرف اور صرف وہی ہوسکتی ہے جو اللہ کی جانب سے ہو اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ

"کہہ دیجیے کہ بے شک اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے۔"

(سورۃ البقرہ:۱۲۰)

اس کے لیے بنیادی شرط اللہ پر ایمان ہے۔ ایمان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ایمان لانے والے شخص کے قلب کو ہدایت عطا کرتا ہے:

وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ

"اور جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ اس کے قلب کو ہدایت عطا کرتا ہے۔"

(سورۃ التغابن:۱۱)

انسانوں کو صحیح راہ کی جانب چلنے یا راہ مستقیم کی جانب اللہ کی رہنمائی بہت کافی ہے:

وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝۳۱

"اور آپ کا رب ھدایت ونصرت کے لیے کافی ہے۔" (سورۃ الفرقان:۳۱)

اس ہدایت کا منبع وماخذ قرآن مجید فرقان حمید ہی ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۲۳

"اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ آپس میں ملتی جلتی اور بار بار دہرائی ہوئی آیات (پر مشتمل ہے) جس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں پھر ان کے جسم ودل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اب جو چاہے اللہ (کے قانون کے مطابق) اس سے ہدایت لے لے اور جو چاہے ضلالت لے لے (اور گمراہی چننے والوں کا) ہادی کوئی نہیں۔" (سورۃ الزمر:۲۳)

اس آیت کریمہ کی رو سے بہترین ہدایت بہرحال قرآن مجید ہی ہے اس سے بہتر ہدایت ممکن نہیں ہے۔ اس ہدایت کے متعلق کہا گیا کہ جو چاہے، جب چاہے اس سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے اور جو خود ہی نہ چاہے تو ظاہر ہے یہ اس کا اپنا انتخاب ہے۔ تاہم جو کوئی بھی ضلالت یا گمراہی کی راہ اختیار کرے گا اس کے متعلق واضح طور پر بتادیا گیا کہ پھر اس کو ہدایت کہیں سے نہیں مل سکتی، کیونکہ اس نے خود جان بوجھ کر راہِ ہدایت چھوڑ کر راہِ ضلالت چنی ہے لہذا اب اس پر ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ گویا راہ ہدایت اور راہ ضلالت اللہ تعالیٰ نے واضح کر دی ہیں، اب یہ انسانوں کی مرضی ہے کہ وہ کون سی راہ اختیار کرتے ہیں۔

انسان کے پاس تقدیرات کے انتخاب کی آزادی ہے

اس حوالے سے جہاں تک نوع انسانی کا تعلق ہے یہاں صورت حال میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جہاں تک حیوانات، نباتات و جمادات کا تعلق ہے وہ اپنی متعین شدہ تقدیرات سے سرِ موانحراف نہیں کر سکتے، یہ ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ لیکن انسان کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے اسے دو راہوں میں سے ایک راہ کے انتخاب کی اجازت دے دی ہے یعنی وہ چاہے تو برائی کی راہ اختیار کر لے یا چاہے تو نیکی یا تقویٰ کی راہ اختیار کر سکتا ہے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝۱۰

"اور ہم نے اسے (انسان) کو دو راستے دکھا دیئے۔" (سورۃ البلد ۱۰)

یعنی انسان کو خیر اور شر میں سے ایک راہ کے انتخاب کی اجازت دے دی گئی ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳

"ہم نے اسے زندگی کا صحیح راستہ دکھا دیا (اب اس کی مرضی خواہ) وہ شکر کرے یا انکار کرنے والوں میں سے ہو جائے۔" (سورۃ الدھر: ۳)

گویا انسان کو تقدیرات کے انتخاب کی اجازت دی گئی ہے، لیکن یہاں یہ امر ذہن میں رکھیئے کہ انسان جو بھی تقدیر اختیار کرے اس کی متعدد راہیں ممکن نہیں۔ کسی بھی منتخب کردہ تقدیر کے یا تو اچھے نتائج نکلیں گے یا برے تیسری کوئی راہ ممکن نہیں ہے۔ انتخاب کا حق بہر حال انسان کو دیا گیا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

تو اپنی سرنوشت خود اپنے ہاتھ سے لکھ
خالی رکھی ہے خامہ ء حق نے تیری جبیں

اس حقیقت کو کہ انسان دو راہوں میں سے ایک کے انتخاب کا مکلف ہے۔ قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ

"ان سے کہہ دیجیئے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے پس جو چاہے اس

پر ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے۔" (سورۃ الکہف:۲۹)

یہ انتخاب، انسانی زندگی کی چھوٹی چھوٹی اور معمولی سی معمولی سرگرمی سے لیکر تمام بڑے بڑے فیصلوں پر یکساں محیط ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی سرگرمی ایسی نہیں جس میں وہ اس انتخاب کے مرحلے سے نہ گذرتا ہو۔ انسان اپنی پوری زندگی میں جو بھی افعال انجام دیتا ہے وہ انہی دو درجہ بندیوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ ایک عام صورتحال ہے کہ ایک انسان بعض افعال میں اچھی یا صحیح راہ کا انتخاب کرلے اور بعض میں منفی یا تباہی کی راہ منتخب کرے۔ روزِ قیامت حتمی فیصلہ انہی منجملہ تمام افعال کے حتمی مثبت یا منفی میزان کی بنیاد پر ہو گا۔ از روئے قرآن روزِ قیامت انسانوں کے تمام اعمال کا وزن ہو گا جس کے اچھے اور صالح اعمال کا وزن زائد ہو گا وہ جنتی جبکہ جس کے برے اور غلط افعال کا وزن زیادہ ہو گا وہ جہنمی ہو گا۔

انسان تقدیرات کے نتائج بدلنے پر قادر نہیں ہے

جس طرح حیوانات، نباتات و جمادات کی تقدیریں متعین ہیں جس میں تبدیلی کا کوئی تصور تک ممکن نہیں۔ اسی طرح وہ تمام تر اچھے اعمال جو انسان انجام دے سکتا ہے یا برے افعال جو وہ کر سکتا ہے ان تمام تر افعال کی تقدیرات بھی متعین ہیں اور ان میں بھی تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی بھی انسان خواہ وہ کہیں ہو، کسی بھی عقیدے کا حامل ہو، وقت کے کسی بھی لمحے میں زندہ ہو خواہ کتنی ہی چھوٹی سی چھوٹی نیکی کرے یا بدی کرے اس کے نتائج معینہ اور طے شدہ ہیں۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ بعض نتائج اعمال کی نوعیت و ماہیت کی بنا پر دیر سے مرتب ہوتے ہیں اور بعض فی الفور۔ مثال کے طور پر تکبر ایک ایسی برائی ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ فی الفور ملتا ہے اور اس میں کبھی دیر نہیں ہوتی۔ جنسی بے راہ روی ایک ایسا فعل بد ہے جس کے برے نتائج کچھ عرصے کے بعد سامنے آتے ہیں۔ لہذا یہ صورتِ حال افعال پر مبنی ہوتی ہے۔ تاہم اس امر سے قطع نظر کہ یہ نتائج کب مرتب ہوتے ہیں یہ ایک فیصلہ شدہ امر ہے کہ نتائج برحق ہیں اور وہ جلد یا بدیر کرنے والے کے سامنے ضرور آتے ہیں۔ یہ کائنات انہی معنوں میں برحق ہے کہ یہاں کسی بھی فعل کا نتیجہ مرتب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝۲۲

"اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر نفس کو اس کے کیئے کا بدلہ دیا جائے اور لوگوں پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

(سورۃ الجاثیہ:۲۲)

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی اختیار و ارادے سے مراد تقدیرات کے انتخاب کی آزادی ہے، ان کے نتائج کو تبدیل کرنے کی نہیں۔

انسان اپنے اعمال کا خود مکلف ہے

یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسان کو اپنے اعمال کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ انسان کو شعور کی دولت عطا کی گئی ہے، اسے صحیح اور غلط دونوں راہیں بتادی گئی ہیں۔ اب وہ اپنی مرضی سے جو راہ بھی منتخب کرے ظاہر ہے اس کی ذمے داری اسی پر آئے گی اور کوئی دوسرا اس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۝۳۸

"اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

(سورۃ النجم:۳۸)

ہر انسان صرف اور صرف اپنا مکلف ہے۔ یہاں بوجھ میں شراکت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بنیادی اصول یہی ہے کہ اپنی اپنی پیٹھ اپنا اپنا بوجھ، سورۃ النجم میں واضح اور دوٹوک انداز میں بتادیا گیا کہ:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۝۳۹

"انسان کے لیے اس کی سعی سے ماسوا کچھ بھی نہیں۔" (سورۃ النجم:۳۹)

اس آیت میں لفظ سعی کا مادہ س،ع،ی ہے۔ جس کے معنی قصد اور ارادے کے ساتھ کسی کام کے لیے کوشش، دوڑ دھوپ اور جدوجہد کے بھی ہیں۔ انسان اسی شے کے لیے جدوجہد کرتا ہے جس کے لیے ارادہ کرتا ہے۔ بالالفاظ دیگر ارادہ اور جدوجہد دونوں انسانی

اختیار میں ہیں، اب یہ انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اپنی سعی اور جدوجہد کا رخ کس جانب رکھتا ہے۔ جیسی اس کی سعی ہو گی ویسے نتائج مل جائیں گے۔ اس حوالے سے بنیادی اصول یہ ہے کہ:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾

"ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گروی ہے۔" (سورۃ المدثّر:٣٨)

یا یہ کہ:

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾

"جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔" (سورۃ التوبہ:٨٢)

یہی وجہ ہے کہ انسان جیسے افعال کرتا ہے ویسے ہی نتائج اس کے سامنے آجاتے ہیں اور روز قیامت بھی یہی ہو گا۔

هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٣٣﴾

"پس جو عمل وہ کرتے تھے انہی کا ان کو بدلہ ملے گا۔" (سورۃ السبّا:٣٣)

باب۔ 2

قوانینِ خلق

گذشتہ باب میں اس امر کا بیان دیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی کسی شے کو تخلیق کرتا ہے تو اس کی تقدیرات بھی متعین کر دیتا ہے یعنی اس خاص شے کے فرائض اور وہ قوانین جن کے تحت اس شے نے اپنے فرائض انجام دینے ہیں ان سب کی ہدایت یا رہنمائی اسے عطا کر دیتا ہے۔ پھر وہ شے ان قوانین سے باہر نہیں جا سکتی اور نہ ہی انحراف کا کسی قسم کا کوئی تصور رکھتی ہے۔ تاہم انسانوں کے حوالے سے اس ضمن میں صورتِ حال یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو مختلف النوع تقدیرات کا پابند نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے لاتعداد تقدیرات میں سے کسی بھی تقدیر کے انتخاب کی آزادی عنایت کی گئی ہے تاہم انسان تقدیرات تو منتخب کر سکتا ہے لیکن ان تقدیرات کے نتائج کی تبدیلی پر وہ قادر نہیں ہے۔

یہاں لامحالہ یہ لازمی تھا کہ انسان کو مختلف النوع تقدیرات اور ان کے نتائج کے بارے میں مکمل آگاہی دی جاتی تاکہ انسان خوب سوچ سمجھ کر ان تقدیرات کا انتخاب کرے، لامحالہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ رہنمائی انسانوں کو مختلف الہامی کتابوں اور انبیاء کرام علیہم السلام کی شکل میں فراہم کی گئی جن پر یہ کتابیں نازل ہوئیں۔ تاہم امتداد زمانہ سے ان میں سے کوئی بھی کتاب ماسوا قرآن مجید فرقان حمید کے اپنی اصل حالت میں نہیں بچی۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جس میں تاقیامت انسانوں کو اس حوالے سے مکمل اور جامع

رہنمائی عطا کر دی گئی ہے تاکہ وہ جو بھی تقدیر منتخب کریں اس جامع و کامل رہنمائی کی روشنی میں کریں۔ قرآن مجید میں انسانوں کی زندگی سے متعلق کئی اصول و قوانین بیان کر دیئے گئے ہیں، تاہم کچھ اصول و قوانین ایسے ہیں جو بالکل اساسی نوعیت کے ہیں۔ زیر نظر باب اور آئندہ ابواب میں ان بالکل بنیادی اصولوں اور قوانین کو بیان کیا گیا ہے۔ زیر نظر باب میں ان بنیادی قوانین کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کا تعلق پوری نوع انسانی سے ہے۔ باالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے جب نوع انسانی کو خلق کیا تو اسے بہ حیثیت نوع کچھ بالکل بنیادی تقدیرات یا قوانین کا پابند کر دیا گیا۔ موجودہ باب میں انہی قوانین پر بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک اس حوالے سے ترتیب مباحث کا تعلق ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ارشاد فرمایا ہے کہ انسانوں کی بہ حیثیت نوع پیدائش کا بنیادی مقصد آزمائش ہے۔ آزمائش سے بنیادی طور پر کیا مراد ہے اور اس کی نوعیت و ماہیت کیا ہے؟ یہ چونکہ اساسی نوعیت کے سوالات ہیں لہذا انہیں سب سے پہلے قانون آزمائش کے تحت زیر بحث لایا گیا ہے۔ آزمائش صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کو اختیار و ارادہ کی آزادی دی جائے اور اس آزادی کے نتیجے میں وہ جو افعال انجام دے ان کے نتائج کا بھی مکلف ہو۔ لہذا اس امر کو قانون مکافات عمل کے تحت دوسرے قانون کے طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ قانون مکافات عمل کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان کو وہی نتائج ملیں جس کی اس نے سعی کی ہو اور یہ انسانوں کی دنیا کا ایک بین قانون بھی ہے کہ انسانوں کو ان کی سعی سے ماسوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس کھلی حقیقت کو تیسرے قانون، قانون سعی و اکتساب میں بیان کیا گیا ہے۔

انسان جو افعال انجام دیتا ہے ان میں ماسوا مستثنیات اکثر و بیشتر افعال ایسے ہیں جن کے نتائج ایک خاص مدت کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں باقاعدہ صراحت کر دی ہے کہ وہ انسانوں کو ان کے اعمال پر فوری طور پر گرفت میں نہیں لیتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون، قانون تاجیل و امہال کے نام سے بہ حیثیت چوتھے قانون کے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

پانچویں قانون، یعنی قانون مشیت و حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ کا یہ بین قانون بیان کیا

گیا ہے کہ وہ انسانوں پر ظلم نہیں کرتا۔ ظلم تو درکنار وہ تو ظلم کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا انسانوں پر جو بھی مصائب یا مشکلات / تکالیف وغیرہ آتی ہیں وہ ان کے اپنے اعمال بد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

آزمائش کا تقاضا تھا کہ انسانوں کو نیک و بد دونوں راہوں میں اختیار کی اجازت دی جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار انسانوں کو دیا، اختیار کی آزادی کا یہ قانون بہ عنوان قانون احترام آزادی کے نام سے چھٹے قانون کی حیثیت سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان قوانین کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ قانون ابتلاٗ و آزمائش

اللہ تعالیٰ نے پوری بنی نوع انسانی کے لیے جو تقدیرات / قوانین متعین کیئے ہیں ان میں ایک بہت اہم بلکہ اہم ترین تقدیر آزمائش ہے بلکہ از روئے قرآن انسان کی بہ حیثیت نوع تخلیق کا مقصد آزمائش ہی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾

”اسی نے موت وحیات کو پیدا کیا تا کہ وہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔“ (سورۃ الملک:۲)

یہ امر از روئے قرآن تخلیق ارض و سماوات کے وقت سے ہی متعین ہے۔

وَھُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرۡشُہٗ عَلَی الۡمَآءِ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ

”اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا، اس کا عرش پانی پر تھا۔ تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل والا کون ہے؟“

(سورۃ ھود:۷)

سختی اور آسودگی دونوں اس آزمائش کی ہی مختلف اشکال ہیں:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

"ہر نفس کو موت کے تجربے سے گذرنا ہے اور ہم تم کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں اور تمہیں ہماری طرف ہی لوٹنا ہے۔"

(سورۃ الانبیاء:۳۵)

اس آزمائش کا ذریعہ زمین پر اور زمین میں پیدا کی جانے والی تمام اشیاء ہیں۔ باالفاظ دیگر زمین کی ہر ہر شے انسان کے لیے ذریعۂ آزمائش ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ پوری حیات ایک آزمائش ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾

"روئے زمین پر جو کچھ ہے اسے ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تا کہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔"

(سورۃ الکہف:۷)

پوری نوع انسانی ایک دوسرے کے لیے آزمائش ہے

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾

"اور ہم نے آپؐ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے کیا تم صبر کرو گے ؟ اور تمہارا رب تو دیکھنے والا ہے۔" (سورۃ الفرقان:۲۰)

اس آزمائش کا تذکرہ (سورۃ المائدہ:۴۸)، (سورۃ العنکبوت:۱۔۳) میں بھی کیا گیا ہے۔ (سورۃ التغابن:۱۵) میں کہا گیا کہ مال اور اولاد دونوں ذریعۂ آزمائش ہیں۔ اس آزمائش کی شکل دشمن کا خوف، بھوک و پیاس اور مال و جان کا خسارہ بھی ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ متذکرہ بالا آیات میں بیان کیا گیا انسانی زندگی کا ہر ہر لمحہ اس آزمائش سے عبارت ہے چاہے مشکل ہو یا آسانی، صورت حال کسی بھی قسم کی ہو وہ بہر حال انسان کو اس

کی شخصیت کی تعمیر کے مواقع ہی بہم پہنچاتی ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اس آزمائش پر کیسے پورا اترتا ہے۔ آزمائش کے حوالے سے قرآن مجید میں دو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: اوّل 'نبلو' دوم 'فتنہ'۔ ان الفاظ کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔ نبلو

قرآن مجید میں آزمائش کے حوالے سے متعدد مقامات پر یہ لفظ آیا ہے، جس کا مادہ ب، ل، و ہے۔ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں: (الف) کسی کا حال معلوم کرنا یعنی اس کے متعلق جو باتیں معلوم نہ ہوں انہیں معلوم کرنا اور (ب) کسی چیز کی اصل حالت کا ظاہر ہونا خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔ جب یہ لفظ خدا کے لیے استعمال ہو گا تو وہاں صرف دوسرے معنی مراد ہوں گے، کیونکہ خدا اعلام الغیوب ہے اس لیے اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی کی حالت سے بے خبر ہے۔ لہذا اس لفظ کے بنیادی معنی حالات کا معلوم کرنا یا اصل حقیقت کا ظاہر کرنا ہیں۔

یہ امر اللہ تعالیٰ کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ کسی کو آزمائے۔ اسے تو ہر ہر شے خواہ وہ کوئی بھی ہو اس کا کامل علم ہے۔ جب وہ سب کچھ جانتا ہے تو اس کی جانب سے آزمائش ایک بے معنی بات ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انسان خود اپنی صلاحیتوں کو آزمائے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے جس میں ان کی صلاحیتوں کی نمو کے مواقع ہوتے ہیں۔ اس طرح انسان اپنی صلاحیتوں کو نمو دیتا ہے، اسے مشکل حالات میں اپنی صلاحیتوں کی جانچ کے مواقع ملتے ہیں اور اس طرح اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بھی درحقیقت اس کی رحمت ہے، کیونکہ اسی کے ذریعے انسان مشکلات سے نبرد آزما ہوتا ہے آگے بڑھتا ہے، اس طرح اس کی شخصیت یا اقبال کی اصطلاح میں خودی کی تعمیر ہوتی ہے۔

سورۃ الدھر میں 'ابتلیٰ' کے لفظ کو قرآن مجید نے ایسے موقع پر استعمال کیا ہے جس سے مضمر جوہروں کے محسوس شکل میں سامنے آنے کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی پیدائش، مرد اور عورت کے نطفے کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ نطفہ ایسے باریک جرثوموں پر مشتمل ہوتا ہے جو خوردبین کے بغیر نظر بھی نہیں آسکتے۔ لیکن انہی جرثوموں میں پورے کا پورا انسانی بچہ چھپا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے قرآن کہتا ہے:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٢﴾

"ہم نے انسان کی پیدائش ایک ملے جلے نطفے سے کی (اور ایسا انتظام کیا کہ رحمِ مادر میں اس کے مضمر جوہروں کی نمو ہوتی جائے) تا نکہ وہ ایک سننے اور دیکھنے والا انسانی بچہ بن جائے۔" (سورۃ الدھر:۲)

یہ ہے ابتلیٰ کا صحیح نقشہ، مضمر جوہروں کا محسوس شکل میں سامنے آجانا، ان کی نمو ہو جانا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ابتلی سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی کو آزمانا نہیں کیونکہ یہ بذاتِ خود ایک بے معنی بات ہے۔ ایک جامع العلوم ہستی کی بابت یہ تصور بھی ممکن نہیں لہذا آئندہ مباحث میں لفظ 'آزمائش' سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمو ذات کے مواقع کی فراہمی ہوگا تا کہ انسان اپنی شخصیت / انا / خودی کی تعمیر کر سکے۔ یہ تعمیر اچھے اور برے دونوں قسم کے حالات میں ممکن ہوتی ہے یعنی مشکلات میں اور کامیابیوں و کامرانیوں کے ادوار میں بھی، اسی وجہ سے آزمائش دونوں صورتوں میں ممکن ہے۔

سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ قومِ فرعون، تمہیں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رکھا کرتی تھی ہم نے تمہیں ان کے پنجہ ءاستبداد سے نجات دلائی۔

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾

"جب ہم نے تم کو قوم فرعون سے مخلصی بخشی وہ تم کو بڑا دکھ دیتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔" (سورۃ البقرہ:۴۹)

قوم فرعون کے مظالم سے بنی اسرائیل کو نجات اس لیے دلوائی گئی تا کہ یہ دیکھا جا سکے کہ آزادی ملنے پر وہ کس قسم کے طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ غزوہ بدر میں اللہ کی امداد و تائید کا مقصد احسانات کی جانچ تھی۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ

وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

"تم نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا اور (اے محمدؐ!) جس وقت آپؐ نے کنکریاں پھینکی تھیں تو حقیقت یہ ہے کہ تم نے نہیں پھینکی تھی، خدا نے پھینکی تھی اور اس سے غرض یہ تھی کہ مومنوں کو اپنے احسانوں سے اچھی طرح آزمالے، بے شک خدا سننے والا دیکھنے والا ہے۔"

(سورۃ الانفال:۱۷)

بنی اسرائیل کو اقوام عالم سے منتخب کیا گیا، انہیں دیگر اقوام کے مقابلے میں سرفراز کیا گیا، انہیں جو مقام دیا گیا اس میں بھی ان کی نمود ذات کے مواقع تھے۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

"ہم نے بنی اسرائیل کو اہل عالم میں سے دانستہ منتخب کیا تھا اور ان کو ایسی نشانیاں دی تھیں جن میں صریح آزمائش تھی۔" (سورۃ الدّخان:۳۳-۳۲)

ظاہر کر دینے کے معنی میں یہ الفاظ سورۃ الطارق میں آیا ہے:

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴿۹﴾

"جس دن تمام چھپی ہوئی باتیں ظاہر کر دی جائیں گی۔" (سورۃ الطارق:۹)

سورۃ آل عمران میں ہے:

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ

"تاکہ اللہ ان باتوں کو ظاہر کر دے جو تمہارے سینوں میں تھیں۔"

(سورۃ آل عمران:۱۵۴)

سورۃ یونس میں ہے:

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ

"وہاں ہر شخص اپنے اعمال کو سامنے موجود دیکھے گا جو اس نے پہلے کیئے تھے۔" (سورۃ یونس:۳۰)

اسی طرح بعض دیگر مقامات مثلاً (سورۃ المؤمن:۳۰) میں بھی اسے ظاہر کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابتلا سے مراد نمو ذات ہے جو مشکل حالات اور سہولت و آسائش دونوں صورتوں میں ممکن ہوتی ہے اور جو اس میں سرخرو ہو جاتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے جو اسی قسم کی مختلف آزمائشوں میں پورے اترے اور کامیاب ہوئے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

"جب ابراہیم کو اس کے رب نے بعض باتوں کے ذریعے سے آزمایا اور اس نے ان کو پورا کر دکھایا (اس پر اللہ نے فرمایا) میں یقیناً تجھے انسانوں کا سردار مقرر کرنے والا ہوں۔" (سورۃ البقرہ:۱۲۴)

۲۔ فتنۃ

آزمائش کے حوالے سے قرآن مجید میں جو دوسرا الفاظ استعمال ہوا ہے وہ فتنۃ ہے۔ اس کا مادہ ف، ت، ن ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں سونا یا چاندی کو آگ میں گلانا تاکہ اس کا کھوٹ الگ ہو جائے۔ اسی سے اس کے معنی کسی چیز کی اصلیت کو ظاہر کرنے کے آتے ہیں۔ چنانچہ الفتانۃ کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر سونا، چاندی کو گھس کر ان کی اصلیت کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ فتنہ کے معنی پرکھنے اور آزمائش کرنے کے بھی آتے ہیں۔ قرآن مجید میں (سورۃ العنکبوت:۲۔۳)، (سورۃ الزمر:۴۹)، (سورۃ التغابن:۱۵)، (سورۃ الدخان:۱۷) کے علاوہ دیگر متعدد پر اسے آزمائش کے معنوں میں لایا گیا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ آزمائش کے علاوہ دیگر مختلف معنوں میں بھی آیا ہے مثلاً (سورۃ التوبہ:۱۲۶) میں جنگ کی مصیبتوں اور مشکلات کے معنوں میں۔ (سورۃ الصافات:۱۶۲) میں صحیح راستے سے ہٹا کر غلط راہ پر لگا دینے (سورۃ النساء:۹۱) میں جنگ، (سورۃ الزمر:۴۹)، (سورۃ المائدہ:۴۹) اور (سورۃ بنی اسرائیل:۷۳) میں اسے گمراہی یا راہ ہدایت سے ہٹا دینے، (سورۃ البقرہ:۱۹۳) اور (سورۃ الانفال:۳۹) میں ان رکاوٹوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو دین خداوندی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ ایذا، مصیبت اور تکلیف (سورۃ الحج:۱۱)، سزا یا عذاب (سورۃ الصافات:۶۳)، دھوکہ

اور فریب (سورۃ البقرہ:۱۰۲)، فریب خوردہ اور گمراہ (سورۃ القلم:٦)، سزا دینے (سورۃ الانعام:۵۳) اور معذرت اور حجت (سورۃ الانعام:۲۳) کے معنوں میں اس کا استعمال کیا گیا ہے۔

جہاں تک آزمائش کا تعلق ہے، ازروئے قرآن بنی نوع انسان کی تخلیق کا مقصد ہی آزمائش ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو مختلف قسم کے مواقع فراہم کرتا ہے جن سے ان کی ذات کی نمو ہو سکے، اس کٹھالی سے تمام انسانوں کو بہر صورت گذرنا ہوتا ہے۔ یہ مشیت ایزدی کی ایک ایسی تقدیر ہے جس سے کسی صورت کسی انسان کو فرار ممکن نہیں ہے۔ موت و زیست کی تخلیق کا مقصد ہی انسانوں کی آزمائش ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ﴿۲﴾

"اسی نے موت وحیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ غالب بخشنے والا ہے۔" (سورۃ الملک:۲)

یہ امر تخلیق ارض و سماوات کے وقت سے ہی معین ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ

"اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں خلق کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل والا کون ہے؟"

(سورۃ الھود:۷)

سختی اور آسودگی دونوں اس آزمائش کی مختلف شکلیں ہیں

كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

"ہر متنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں اور تمہیں ہماری طرف ہی لوٹنا ہے۔"

(سورۃ الانبیاء:۳۵)

اس آزمائش کا ذریعہ زمین پر اور زمین میں پیدا کی جانے والی تمام تر اشیاء ہیں۔ بالفاظ

دیگر زمین کی ہر ہر شے انسان کے لیے ذریعۂ آزمائش ہے باالفاظ دیگر پوری حیات ایک جامع آزمائش ہے۔

قانون عسر ویسر

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بنیادی طور پر قانون ابتلاءٔ و آزمائش کا تکملہ ہے یعنی قانون ابتلاءٔ و آزمائش کا لازمی اختتام ہے۔ اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ جب بھی، کہیں بھی، کسی بھی شخص یا قوم کو آزمائش کی بھٹی سے گذارتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر اسے فراغت، سہولت، آسائش، فراخی یا معیشت کی افراط سے نوازتا ہے بشرطیکہ وہ فرد یا قوم اس جانچ یا آزمائش پر لازمی پوری اتری ہو۔ اس قانون کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦

"ہر مشکل کے ساتھ آسانی (بھی) ہے۔ یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی (بھی) ہے۔" (سورۃ الم نشرح:۵-۶)

اس حوالے سے ان آیات کریمہ کے دو الفاظ عسر اور یسر پر تدبر ضروری ہے۔ لفظ عسر کا مادہ ع، س، ر ہے۔ اس کے معنی تنگی، سختی، مصیبت اور مشقت کے ہیں۔ ان معنوں میں یہ مادہ قرآن مجید میں (سورۃ البقرہ:۱۸۵) اور (سورۃ الفرقان:۲۶) میں آیا ہے۔ معاملات میں کشادہ روی کی کمی اور اخلاقی لحاظ سے تنگ ہو جانا بھی اس کے معنی میں شامل ہے۔ سورۃ الطلاق میں یہ مادہ میاں بیوی کے مابین باہمی کھچاؤ اور عدم مطابقت کے معنوں میں آیا ہے۔ (سورۃ الطلاق:٦) معاشی بدحالی اور تنگ دستی بھی اس کے معنوں میں شامل ہے۔

لفظ یسر کا مادہ ی، س، ر ہے۔ یہ عسر کی ضد ہے۔ اس کے معنی سہولت، آسانی، فراخی، کشائش، آسودگی، تونگری، معاشی فارغ البالی، بہتات، معاملات کا آسان اور سہل ہو جانا یا باآسانی مہیا ہونے کے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے معنی کھل جانا اور ہلکا پھلکا ہونے کے بھی ہیں۔ قرآن مجید میں یہ تونگری، آسودگی یا غنی ہونے کے معنوں میں (سورۃ البقرہ:۲۸۰) اور عسر کے مقابلے میں (سورۃ البقرہ:۱۸۵) اور مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے۔ نرمی سے بات کرنے کے معنوں میں (سورۃ بنی اسرائیل:۲۸) میں آیا ہے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ از روئے

قر آن کوئی بھی مشکل خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کے بعد بہر حال آسانی، سہولت، آسائش نصیب ہوتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی مختلف النوع نعمتوں کا حصول لازمی ہے۔ ظاہر ہے یہ اللہ کا قانون ہے اور کسی صورت، کسی بھی حوالے سے ناقابل تبدیل ہے۔

۲۔ قانون مکافاتِ عمل

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ازروئے قرآن اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ جو فرد جس قسم کے افعال انجام دے اسے اسی قسم کا نتیجہ مل جائے۔ باالفاظِ دیگر انسان جیسے افعال انجام دیتا ہے اسے اسی قسم کے نتائج کا سامنا کرنا پڑجاتا ہے یعنی اچھے افعال کے اچھے نتائج اور برے افعال کے برے نتائج۔ یہی قانون مکافات عمل ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا قرآن مجید میں کئی مقامات پر تذکرہ کیا گیا ہے، جو بدیہی طور پر اس قانون کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ اس حوالے سے مختلف آیات قرآنی کے حوالے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح انجام دیئے ان کے لیے جنت کے باغ ہیں۔ (سورۃ البقرہ:۲۵ اور ۸۲)

باالفاظ دیگر اگر ایمان لاؤ گے اور اعمال صالحہ کروگے تو جنت کے حقدار ہوگے۔

۲۔ جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے نہ ان کو کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمناک ہوں گے۔ (سورۃ البقرہ:۳۸)

۳۔ جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد اس کا کسی پر احسان نہیں دھرتے، نہ کسی کو تکلیف دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس محفوظ ہے۔ نہ ان کو خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (سورۃ البقرہ:۲۶۲)

۴۔ نہ تم ظلم کروگے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ (سورۃ البقرہ:۲۷۹)

یعنی اگر تم ظلم کروگے تو تم پر بھی ظلم ہوگا۔

۵۔ اگر کتاب کے بعض حصوں کا اتباع کروگے اور بعض سے انکار کروگے تو اس دنیا میں ذلیل وخوار ہوگے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا ہوگے۔ (سورۃ البقرہ:۸۵)

۶- اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو خدا سے بہت اچھا صلہ پاتے۔(سورۃ البقرہ:۱۰۳)

۷- تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد کرتا رہوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرنا۔ (سورۃ البقرہ:۱۵۲)

اس آیت کریمہ میں قطعی واضح اور دوٹوک انداز میں کہہ دیا گیا ہے کہ اگر تم مجھے (اللہ کو) یاد رکھوگے اس کا ذکر کروگے تو میں (اللہ تعالیٰ) تمہیں یاد رکھوں گا۔

۸- اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب ہوگے۔(سورۃ آل عمران:۱۳۹)

۹- اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو یقیناً اللہ کی رحمت اور بخشش اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں کہیں بہتر ہو گی۔(سورۃ آل عمران:۱۵۷)

۱۰- اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہاری مدد چھوڑ دے تو کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔(سورۃ آل عمران:۱۶۰)

۱۱- اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کروگے تو تمہیں بڑا اجر ملے گا۔(سورۃ آل عمران:۱۷۹)

۱۲- اگر تم کبائر (گناہ کبیرہ) سے بچو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے عیب دور کردے گا اور تمہیں معزز مقام عطا کرے گا۔ (سورۃ النساء:۳۱)

۱۳- اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور انہیں نعمتوں والے باغوں میں داخل کرتے۔(سورۃ المائدہ:۶۵)

۱۴- اگر وہ تورات اور انجیل اور جو کچھ ان کے رب کی طرف سے ان پر اتارا گیا ہے اس کا اتباع کرتے تو ضرور انہیں فراواں رزق ملتا۔(سورۃ المائدہ:۶۶)

۱۵- اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین سے ان پر برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ (سورۃ الاعراف:۹۶)

۱۶- جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے مخلوط نہیں کیا انہی لوگوں کے لیے امن مقدر ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔ (سورۃ الانعام:۸۲)

۱۷- اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کروگے تو وہ تمہارے لیے بڑے امتیاز کا سامان پیدا کر دے گا اور تمہاری کمزوریوں کو دور کردے گا۔(سورۃ الانفال:۲۹)

۱۸- آپ کفار سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آجائیں تو جو وہ پہلے کر چکے ہیں وہ معاف کر دیا

جائے گا اور اگر وہ (پھر انہی کرتوتوں کی طرف) لوٹیں گے تو پہلے لوگوں کی جو سنت گذر چکی ہے (وہی ان کے ساتھ بھی دہرائی جائے گی)۔ (سورۃ الانفال:۳۸)

۱۹- یہ (عذاب) تمہارے گذشتہ کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔ (سورۃ الانفال:۵۱)

۲۰- اگر تم میں بیس ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آجائیں گے۔

(سورۃ الانفال:۶۵)

۲۱- اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔(سورۃ محمد:۳۸)

۲۲- جو میرے ذکر سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔(سورۃ طٰہٰ:۱۲۴)

۲۳- جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ تکلیف میں پڑے گا۔(سورۃ طٰہٰ:۱۲۳)

۲۴- اور جو شخص حد سے نکل جائے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے ہم اس کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔(سورۃ طٰہٰ:۱۲۷)

۲۵- اگر تم شکر کروگے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔(سورۃ ابراہیم:۷)

۲۶- جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور نیک بات کو سچ جانا اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے اور جس نے بخل کیا اور لاپرواہ بنا رہا اور نیک بات کو جھوٹ جانا اسے سختی پہنچائیں گے۔(سورۃ الیل:۵۔۱۰)

۲۷- اور جس طرح کی نیکی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گے اور اللہ متقین کو خوب جانتا ہے۔(سورۃ آل عمران:۱۱۵)

متذکرہ بالا آیات قرآن مجید کے قانون مکافات عمل کی کھلی کھلی گواہی ہیں، نہ صرف متذکرہ بالا آیات بلکہ اس حوالے سے اُم الکتاب سے مزید کئی آیات کے حوالے دیئے جاسکتے ہیں جہاں بنیادی پیغام یہی ہے یعنی جیسا کروگے ویسا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا، یہی قانون مکافات عمل ہے۔

۳- قانون سعی واکتساب

قرآن مجید فرقان حمید کا ایک بہت اہم اور بنیادی نوعیت کا قانون یہ ہے کہ "انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اس نے محنت کی۔" یا اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جیسی اور جتنی اس نے محنت کی ہو۔ اس قانون کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾

"اور بے شک انسان کے لیے اس کی سعی سے ماسوا کچھ بھی نہیں۔" (سورۃ النجم:۳۹)

یہ آیت بالکل سیدھے سادے انداز میں اس بنیادی قرآنی حقیقت کی گواہ ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے اس نے خود محنت کی ہو۔ عمومی طور پر بات کی جائے تو اس سے مراد انسانی اعمال اور ان کے نتائج ہیں۔ انسان جو بھی افعال انجام دیتا ہے چاہے وہ اچھے ہوں یا برے اسے ان کے نتائج مل جاتے ہیں۔ اچھے اعمال کے نتائج نعمتوں کی شکل میں اور برے اعمال کے نتائج مشکلات اور عذابوں کی شکل میں۔ یہ نتائج اس دنیا میں بھی مرتب ہوتے ہیں اور قیامت میں تو اس حوالے سے حتمی نتائج سامنے آجائیں گے اور ہر انسان کو اس کے کیئے کا بدلہ دے دیا جائے گا اور کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا قرآن مجید میں کئی مقامات پر تذکرہ کیا گیا ہے۔

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ

"جو بدی کرے گا اسے اس کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔" (سورۃ النساء:۱۲۳)

نہ صرف مندرجہ بالا آیات بلکہ اس حوالے سے تو قرآن مجید سے کئی آیات پیش کی جاسکتی ہیں جہاں واضح طور پر انسان کو اس کے اعمال کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ مثلاً (سورۃ توبہ:۶۶)، (سورۃ المؤمن:۱۷)، (سورۃ الاعراف:۱۴۷)، (سورۃ الطور:۱۶)، (سورۃ الواقعہ:۲۴) اور (سورۃ المطففین:۳۶) وغیرہ۔

انسان کس طرح اپنے اعمال کا خود مکلف ہے؟ اس کا ایک بین ثبوت سورۃ البقرہ کی آیت ۲۷۹ کے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴿۲۷۹﴾

"نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہو گا۔" (سورۃ البقرۃ:۲۷۹)

آیت کے یہ الفاظ جو ایک طرف بنیادی سماجی قوانین میں سے ایک قانون کی طرف انسانیت کی توجہ دلواتے ہیں تو دوسری طرف یہ بالکل سیدھے سادے انداز میں انسانی اختیار و ارادہ کی شہادت بھی ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں بنیادی نقطۂ تدبر یہ ہے کہ انسانوں کو یہ کہا جارہاہے کہ نہ تم ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہو گا۔ یہاں لفظ ظلم کے معنی کا تعین کرنالازمی ہے۔ ظلم کا مادہ ظ، ل، م ہے۔ جس کے معنی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا، حد سے تجاوز کرنا، کسی چیز کو اس کے صحیح مقام سے ہٹادینا کے ہیں خواہ یہ تبدیلی بلحاظِ وقت ہو یا بہ لحاظ مقام، اس کے معنی اندھیرے اور تاریکی کے بھی ہیں یعنی اس جگہ کا روشن نہ ہونا جہاں روشنی کو ہونا چاہیے تھا۔

ان معنوں میں سے کوئی سے بھی معنی لیے جائیں ان میں انسانی اختیار و ارادہ کی نفی ممکن نہیں۔ ملکیت میں بے جا تصرف ہو، حد سے تجاوز کرنا ہو، کسی چیز کو اس کے مقام سے ہٹا دینا ہو۔ یہ تمام افعال انسانی اختیار و ارادہ کی کھلی دلیل ہیں۔ جب انسان یہ افعال انجام دیتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس پر ایسا ہی ظلم خدا کی تقدیر کی صورت میں منطبق ہو جاتا ہے یعنی پہل انسان کرتا ہے اس کے بعد اس کے نتائج خود بخود اسی اعتبار سے مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اقوام کے بارے میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ خدا کبھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے نفوس کو تبدیل نہ کرے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ

"اللہ (کبھی بھی) کسی قوم کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے نفوس میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔" (سورۃ الرّعد:۱۱)

یعنی ابتدا انسان کرتا ہے خواہ وہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر اس کے بعد اسی قسم کے نتائج مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نعمتوں کے حوالے سے بھی یہی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو دینے کے بعد اس وقت تک اس کا سلسلہ منقطع نہیں کرتا

جب تک انسان خود ہی اپنے آپ کو اس کا نااہل ثابت نہ کر دے۔ اگر انسان اپنے عمل سے خود کو اس نعمت کا اہل ثابت کرتا ہے تو وہ نعمت اللہ تعالیٰ کبھی بھی اس سے واپس نہیں لیتا۔

یہ صورتِ حال پھر انسانی اختیار و ارادے کی کھلی دلیل ہے۔ انسان پر جو بھی مصیبت آتی ہے وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾

"اور جو مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے افعال کی وجہ سے ہوتی ہے اور بہت سے گناہوں کو تو وہ (ویسے ہی) معاف کر دیتا ہے۔" (سورۃ الشوریٰ:۳۰)

بُرے اعمال کے نتائج بھی بُرے ہوتے ہیں۔ باالفاظ دیگر وہی صورتِ حال یعنی جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

"تو ان کو ان کے اعمال (بد) کے بُرے بدلے ملے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے ان کو گھیر لیا۔" (سورۃ النحل:۳۴)

روزِ قیامت منفی نتائج کہیں خارج سے نہیں آئیں گے، یہ انسان کے اپنے افعال ہوں گے جنہیں انسان نے پہلے سے بھیج رکھا ہو گا:

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

"یہ ان کاموں کی سزا ہے جو تمہارے ہاتھ آگے بھیجتے رہے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر مطلق ظلم نہیں کرتا۔" (سورۃ آل عمران:۱۸۲)

اس آیت میں استعمال ہونے والے الفاظ 'بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ' پر تدبر لازمی ہے یعنی وہ اعمال جنہیں تم نے اپنے ہاتھوں سے پہلے بھیجا ہو۔ یہ انسان کے وہ افعال ہیں جنہیں وہ اپنے اختیار و ارادہ سے آگے بھیجتا ہے۔ اس حقیقت کا اعادہ (سورۃ یونس:۳۰)، (سورۃ الحج:۹۔۱۰)، (سورۃ الروم:۳۶)، (سورۃ الشوریٰ:۴۸) اور (سورۃ المزمل:۲۰) میں بھی کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے جس کی بنیاد پر اللہ محسنین کے کام کو ضائع نہیں کرتا:

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۝

"بے شک اللہ محسنین کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔" (سورۃ التوبہ:۱۲۰)

اس بات کو ایک مختلف پیرائے میں یوں بھی کہا گیا ہے:

وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ۝

"اللہ شکر گذاروں کو ضرور بدلہ دے گا۔" (سورۃ آل عمران:۱۴۴)

یہی وجہ ہے کہ روزِ قیامت ہر انسانی عمل کا ذرہ ذرہ تولا جائے گا:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۝

"اس وقت جس کے (اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے وہ پسندیدہ حالت میں ہو گا اور جس کے (اعمال کے) پلڑے ہلکے ہوں گے اس کا ٹھکانہ ھاویہ (بھڑکتی ہوئی آگ) ہو گا۔" (سورۃ القارعۃ:٦-٩)

دوسری طرف اس اصول کو اگر معاشیات پر منطبق کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ معاوضۂ محنت، بقدر محنت ہو گا یعنی معاوضہ صرف محنت کا ہے اس سے ماسوا کچھ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ معاشی نظام کے قطعی برعکس جو چار عاملینِ پیدائش کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے محنت واحد عامل پیدائش ہے۔ اس کے نتیجے میں موجودہ معاشی نظام کی بنیاد ہی ساقط ہو جاتی ہے جو اول تا آخر سرمایہ کے معاوضے پر کھڑا ہے۔ اس نظام میں سرمایے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اسے کہا ہی سرمایہ دارانہ نظام جاتا ہے۔ لیکن خالصتاً قرآنی نقطۂ نگاہ سے ماسوا محنت کسی بھی شے کا معاوضہ ممکن نہیں ہے۔

اس قانون کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ از روئے قرآن انسان کی ساخت ہی۔ اس طرح کی رکھی گئی ہے۔ محنت و مشقت کو اس کی گھٹی یا فطرت میں ڈال دیا گیا ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ۝

"ہم نے انسان کو رہینِ محنت پیدا کیا ہے۔" (سورۃ البلد: ۴)

یعنی انسان، زندگی میں کوئی بھی شے صرف اور صرف محنت سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ دنیا میں انسان جو بھی ترقی جائز طریقے سے کرتا ہے وہ بھی اس کی محنت اور اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت کا نتیجہ ہوتی ہے، بغیر محنت آج تک کبھی کسی کو کچھ نہیں ملا۔ اور اگر ملا بھی ہے تو وہ باطل ہے یعنی محض ضائع ہو جانے والا۔ متذکرہ بالا آیت (سورۃ نجم:۳۹) کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان ماسوا محنت کسی بھی شے کو حاصل کرنے پر قادر ہی نہیں ہے اور اگر غلط یا ناجائز طریقے سے حاصل بھی ہو جائے تو وہ اس کے پاس رہتی نہیں ہے جلد یا بدیر بہر حال ضائع ہو جاتی ہے۔

۴- قانون تاجیل وامہال

جہاں تک اس قانون کا تعلق ہے اس قانون کی رو سے انسان جو بھی افعال انجام دیتا ہے ان کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور بر آمد ہوتا ہے۔ اچھے اعمال کے اچھے نتائج اور برے اعمال کے برے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اسے اللہ کا قانون تعجیل بھی کہا جاتا ہے، یہ قانونِ مکافات عمل ہی کا متبادل نام ہے۔ تاہم یہ نتائج اعمال کی نوعیت کے اعتبار سے مرتب ہوتے ہیں۔ بعض افعال ایسے ہیں جن کے نتائج فوری طور پر مرتب ہو جاتے ہیں جبکہ بعض افعال ایسے ہیں جن کے نتائج مستقبل میں مرتب ہوتے ہیں، یہ مستقبل قریب یا بعید دونوں اشکال میں ممکن ہے۔

اس حوالے سے بالخصوص اللہ تعالیٰ اعمال بد یا افعال ظلم کے حوالے سے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر مہلت دیتا ہے تاکہ اگر ظالم رجوع کرنا چاہیں تو کرلیں تاہم اگر وہ اس معینہ مہلت میں ایسا نہیں کرتے تو پھر اللہ انہیں اپنے عذاب شدید کی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ پورا مظہر قانون امہال کہلاتا ہے۔

اس حوالے سے ان تمام اقوام کی مثالیں دی جاسکتی ہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید میں مختلف انبیاء کرام علیہم السلام کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ یہ تمام اقوام مختلف النوع مظالم میں ملوث تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک مدت تک مہلت دی، لیکن جب اس خاص مدت تک ان قوموں کی سمجھ میں حق کی بات نہیں آئی تو انہیں تاریخ میں عبرت کا نشان بنا دیا گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں پر ان کے مظالم کے اعتبار سے فوری گرفت کرتا تو از روئے قرآن زمین پر کوئی انسان زندہ نہیں بچتا۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾

"اگر لوگوں کے گناہ پر اللہ تعالیٰ ان کی (فوری) گرفت کرتا تو روئے زمین پر ایک بھی جاندار نہ باقی بچتا لیکن وہ توانہیں ایک وقت مقررہ تک ڈھیل دیتا ہے جب ان کا وقت آجاتا ہے تو وہ ایک ساعت نہ پیچھے رہ سکتے ہیں نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔" (سورۃ النحل:٦١)

اس آیت کریمہ سے یہ بات قطعی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی مشیت سے انسانوں کو ان کے مظالم کے باوجود ایک خاص مدت تک مہلت عطا کرتا ہے۔ یہ مہلت عطا کرنے کا عمل قانون امہال ہے۔

۵- قانون مشیت و حکمت

اس قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "خدا کبھی بھی، کسی بھی صورت میں، کسی بھی حوالے سے بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں پر ظلم نہیں کرتا جبکہ انسانوں پر آنے والی جملہ مصیبتیں یا مشکلات یا پریشانیاں خود انسانوں کے اپنے اعمال بد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔"

اس قانون پر بحث دو حصوں میں منقسم ہے: اول یہ حقیقت کہ اللہ تعالیٰ کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا جبکہ دوم یہ امر کہ انسان کو پیش آنے والی تمام تر مشکلات / پریشانیاں یا مصائب خود اس کے اپنے غلط افعال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان دونوں اجزا کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

اللہ کبھی کسی پر کبھی بھی، کسی صورت ظلم نہیں کرتا

جہاں تک اس بین حقیقت کا تعلق ہے اسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر:

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿١٨٢﴾

"اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر مطلق ظلم نہیں کرتا۔" (سورۃ آل عمران:١٨٢)

ظلم تو دور کی بات وہ تو ظلم کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔ اس امر کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ پورے قرآن مجید میں الحمد سے لے کر والناس تک کسی بھی مقام پر شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی گئی ہے۔ صرف خیر کی ہے۔ یہ ویسے بھی ممکن نہیں، خود سوچیئے کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ یقیناً نہیں، شر خدا سے کسی صورت، کسی بھی حوالے سے منسوب نہیں ہو سکتا۔

اس حوالے سے قرآن مجید سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں تاہم چند آیات کے حوالے مندرجہ ذیل ہیں۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ

"اچھی زمین اپنے رب کے حکم سے اچھی پیداوار دیتی ہے جبکہ بری زمین سے خراب پیداوار حاصل ہوتی ہے۔" (سورۃ الاعراف: ۵۸)

یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ اچھی زمین کی اچھی پیداوار کی نسبت اللہ تعالیٰ سے ہے جبکہ خراب پیداوار کے لیے کہا گیا کہ وہ خراب زمین سے حاصل ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں کسی بھی فعل کو جو خیر نہ ہو کہیں بھی اللہ تعالیٰ سے منسوب نہیں کیا گیا ہے خواہ وہ بیماری ہو یا کوئی اور مصیبت۔

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿٨٠﴾

"اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔" (سورۃ الشعرآء ۸۰)

یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ بیماری کو انسان سے منسوب کیا گیا ہے۔ "جب میں بیمار ہوتا ہوں۔" لیکن دیکھیئے شفاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہے "تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔"

قرآن مجید خود سرچشمۂ خیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی انسانوں پر بہت بڑی عنایت ہے:

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ

"یہ پوچھتے ہیں تمہارے رب نے تمہاری طرف کیا نازل کیا ہے؟ کہہ دیجیئے کہ اس نے خیر نازل کیا ہے۔ (سورۃ النحل:۳۰)

راہ ہدایت کی نسبت بھی اللہ ہی کی جانب ہے اور وہی رزق عطا کرنیوالا ہے:

الَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَہُوَ یَہۡدِیۡنِ ۙ﴿۷۸﴾ وَ الَّذِیۡ ہُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَ یَسۡقِیۡنِ ۙ﴿۷۹﴾

"جس نے مجھے پیدا کیا پھر سیدھا راستہ دکھایا اور وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔"
(سورۃ الشعرآء:۷۸-۷۹)

انسان کو جو بھی صلاحیتیں عطا ہوتی ہیں ان کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ کی جانب ہے:

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ﴿۴﴾

"اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور بولنا سکھایا۔" (سورۃ الرحمٰن:۴-۳)

یا یہ کہ:

الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۙ﴿۴﴾

"اللہ وہ ہے جس نے انسان کو قلم سے علم دیا۔" (سورۃ العلق:۴)

غزوہ بدر میں مجاہدین کے لشکر جنہیں اللہ نے اپنا لشکر کہہ کر پکارا ہے، جب کفار کی گردنیں اڑا رہے تھے تو ان کے متعلق کہا گیا کہ انہیں تم قتل نہیں کر رہے تھے بلکہ خود اللہ تعالیٰ انہیں قتل کر رہا تھا:

فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡہُمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَہُمۡ ۪

"تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے اللہ خود قتل کر رہا تھا۔" (سورۃ الانفال:۱۷)

اس حوالے سے یہ کہا گیا کہ اس وقت تم لوگ (مسلمان مجاہدین) تیر نہیں چلا رہے تھے اللہ خود تیر چلا رہا تھا:

وَ مَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ۚ

"اور اس وقت تم تیر نہیں چلا رہے تھے اللہ چلا رہا تھا۔" (سورۃ الانفال:۱۷)

بیعت رضوان کے وقت حدیبیہ کے مقام پر جب سر فروشانِ اسلام نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دست مبارک پر بیعت کر رہے تھے تو اس معاہدے کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے، کیونکہ یہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑی فتح کے مترادف تھا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ

"جو لوگ (اے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) آپؐ سے بیعت کر رہے تھے، وہ آپؐ سے نہیں بلکہ اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔" (سورۃ الفتح:۱۰)

یہاں تک کہ ان کے ہاتھ پر رسول اللہ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) کا ہاتھ نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا ہاتھ تھا۔

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ

"ان کے ہاتھ پر (آپ کا ہاتھ نہیں بلکہ خود) اللہ کا ہاتھ تھا۔" (سورۃ الفتح:۱۰)

یہ ان کئی مثالوں میں سے محض چند مثالیں ہیں جن سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے جہاں خیر کو اللہ کی ذات سے منسوب کیا گیا ہے۔

انسانون پر آنے والی مشکلات / مصائب / پریشانیاں خود انسانوں کے اپنے اعمال بد کا نتیجہ ہوتی ہیں

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ انسانوں پر آنے والی تمام تر مشکلات، مصائب یا پریشانیاں صرف اور صرف انسانوں کے اپنے اعمال بد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس امر کا اثبات ان قوموں کے احوال سے بخوبی ہو سکتا ہے جن کی تباہی کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔

اس حوالے سے ان تمام اقوام کی تباہی کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے تو وہاں بھی قرآن مجید نے پہلے ان اسباب و علل کی مکمل وضاحت کی ہے جن کی وجہ سے یہ قومیں تباہ و برباد ہوئیں۔ ان اسباب میں بھی آخری تجزیے میں وہ تمام اقوام خود اپنی تباہی کی ذمے دار ٹھہرتی ہیں۔ نہ وہ اقوام اپنے افعال بد کو اس انتہا تک پہنچاتیں (جہاں عذاب لازم ہو جاتا ہے) نہ وہ تباہ ہوتیں۔ مثال کے طور پر قوم نوح عَلَیْہِ السَّلَامُ کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ

"وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق کیئے گئے اور آگ میں داخل کیئے گئے۔"

(سورۃ نوح:۲۵)

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا ۚ۬ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾

"پھر نوحؑ نے کہا اے میرے رب! انہوں نے میری نافرمانی کی ہے اور ان کا اتباع کیا جن کے مال و اولاد نے بجز نقصان کے کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا اور انہوں نے بڑی سازشیں کیں اور اپنی قوم سے کہتے رہے کہ تم اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا نہ ودّ کو چھوڑنا۔ نہ سواع کو چھوڑنا اور نہ یغوث کو اور نہ یعوق کو اور نہ نسر کو اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا اور (اے خدا!) ظالموں کو صرف ناکامی میں ہی بڑھا۔" (سورۃ نوح: ۲۱۔۲۴)

حضرت نوح علیہ السلام کے یہ الفاظ اس امر کی کھلی کھلی گواہی ہیں کہ ان کی قوم نافرماں برداری اور ظلم کی انتہا تک پہنچ چکی تھی، یہ نافرماں برداری اور ظلم خود انہوں نے کیا تھا اور ظلم کا نتیجہ صرف اور صرف تباہی ہی ہوتا ہے جو اس قوم کا مقدر بنا۔

سورۃ نوح کے علاوہ سورۃ الاعراف میں واضح طور پر کہا گیا کہ پوری کی پوری قوم (ماسوا ان لوگوں کے جو ایمان لے آئے تھے) اندھی تھی۔ (سورۃ الاعراف: ۶۴) سورۃ الانبیاء میں کہا گیا کہ وہ بہت بری قوم تھی۔ (سورۃ الانبیاء: ۷۷) ان میں ایمان لانے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی (سورۃ الشعراء: ۱۲۱)، خود اللہ تعالیٰ نے تصدیق کی کہ ان میں سے جو ایمان لا چکے تھے ان کے علاوہ کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ (سورۃ ھود: ۳۶)

ظاہر ہے یہ صورتِ حال قوم نوحؑ کی خود اپنی پیدا کردہ تھی اور اس کا انجام بھی انہی کو بھگتنا پڑا اور قیامت میں جو مزید ذلت و رسوائی اور عذاب ہو گا وہ بھی ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہو گا۔ "یقیناً خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔" (سورۃ آل عمران: ۱۸۲)

یہی صورتحال حضرت ھود علیہ السلام کی قوم، قوم عاد کے ساتھ بھی تھی۔

- اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی اور ایمان نہیں لائے تھے ان کی جڑ کاٹ دی گئی۔ (سورۃ الاعراف: ۷۲)
- انہوں نے مجرم بن کر خدا سے منہ پھیر لیا تھا۔ (سورۃ ھود: ۵۲)

- انہوں نے حضرت ھود علیہ السلام کی تکذیب کی۔(سورۃ ھود:۵۳)
- انہوں نے (دیدہ دانستہ) اپنے رب کی آیات سے انکار کیا تھا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی تھی اور حق کے دشمن شخص کی اطاعت کی تھی۔(سورۃ ھود:۵۹)
- یہ قوم اپنے رب کی ناشکر گذار تھی۔(سورۃ ھود:۶۰)
- انہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تھا۔(سورۃ الشعراء:۱۲۳)
- ان میں ایمان قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔(سورۃ الشعراء:۱۳۹)
- انہوں نے زمین میں ناحق تکبر کیا تھا۔(سورۃ حٰم السجدہ:۱۵)

ان کے انہی اعمال کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

- اس دنیا میں اور آخرت میں دونوں جگہ ان کے پیچھے لعنت لگادی گئی، ان کے لیے لعنت مقدر ہو گئی۔ (سورۃ ھود:۶۰)
- انہیں ہلاک کر دیا گیا۔(سورۃ الشعراء:۱۳۹)
- انہیں اس دنیا میں رسوائی کا عذاب ملا اور اخروی رسوائی کا عذاب اس سے بھی بڑھ کر ہے۔(سورۃ حٰم السجدہ:۱۶)
- انہیں دردناک عذاب ملا۔(سورۃ الاحقاف:۲۴)
- انہیں ایک ایسی ہوا نے ہلاک کیا جو ہر چیز کو تباہ کر رہی تھی۔(سورۃ الاحقاف:۲۵)

اس طرح سے قوم ثمود کا انجام بھی عبرت آموز ہے۔ انہوں نے جو جرائم کیئے ان کی تفصیل اس طرح قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے:

- انہوں نے ایمان لانے سے انکار کیا۔(سورۃ الاعراف:۷۶)
- وہ زمین میں فساد پھیلاتے تھے۔(سورۃ الاعراف:۷۴)
- انہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی۔(سورۃ الاعراف:۷۷)
- حد سے بڑھ جانے والوں کی اطاعت کی۔(سورۃ الشعراء:۱۵۱)
- انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تھا۔(سورۃ الشعراء:۱۴۱)
- وہ بھلائی سے پہلے برائی میں جلد باز تھے۔(سورۃ النمل:۴۶)

ان کے اپنے ان افعال کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

- انہیں ہیبت ناک کڑک سے ہلاک کر دیا گیا۔(سورۃ الحاقہ:۵)
- یہ ایسی خوفناک کڑک تھی کہ اس کا مقابلہ ان کے بس میں نہ تھا۔(سورۃ الذاریات:۴۵)
- اس ہیبت ناک کڑک نے انہیں باڑ کے بھوسہ کی مانند کر دیا۔(سورۃ القمر:۳۱)

اس حوالے سے قوم لوط علیہ السلام کا تذکرہ بھی نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ یہ قوم امرد پرستی کا شکار تھی جو یقیناً انتہائی بُرے افعال میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید نے ان کے اس فعل بد کی گواہی دی:

- یہ ایسی بے حیائی تھی جو اس سے قبل کسی قوم نے نہیں کی۔(سورۃ الاعراف:۸۰)
- وہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت کے ارادے سے آتے تھے اور یہ حدود فراموشی ہے۔(سورۃ الاعراف:۸۱)
- وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔(سورۃ الحجر:۷۴)
- انہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔(سورۃ الشعراء:۱۶۰)
- وہ ڈاکے ڈالتے تھے اور مجالس میں ناپسندیدہ حرکتیں کرتے تھے۔(سورۃ العنکبوت:۲۹)

ان کے اپنے ان افعال بد کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

- ان پر پتھروں کا مینہ برسا کر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔(سورۃ الاعراف:۸۴)
- ایسے پتھر جو نشان زدہ تھے ان کی بارش کی گئی اور ان کی بستیاں الٹ دی گئیں۔(سورۃ الھود:۸۲)

اس طرح قوم مدین جس کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث کیئے گئے تھے وہ بھی مختلف قسم کے افعالِ بد میں مبتلا تھی اور یہ تمام افعال وہ خود اپنی مرضی سے بالارادہ انجام دیتی تھی۔ ازروئے قرآن ان کے افعال قبیح مندرجہ ذیل تھے:

- ناپ تول میں ڈنڈی مارتے تھے، لوگوں کو ان کے حق سے کم اشیاء دیا کرتے تھے اور اصلاح کے بعد زمین میں فساد کیا کرتے تھے۔(سورۃ الاعراف:۸۵)
- مختلف راستوں پر بیٹھ کر ان لوگوں کو ڈراتے اور روکتے تھے جو اللہ پر ایمان لے آئے تھے اور دین میں ٹیڑھ پن تلاش کرتے تھے۔(سورۃ الاعراف:۸۶)
- یہ لوگ ظالم تھے۔(سورۃ الحجر:۷۸)
- یہ لوگ بستیوں میں فساد مچانے کے لیے پھرا کرتے تھے۔ (سورۃ الشعراء:۱۸۳)

ان کے ان افعال کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

- ان کو ایک خوفناک زلزلے نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں لاشوں کے ڈھیر بن گئے۔
(سورۃ العنکبوت:۳۷)
- ان پر لعنت مقدر کر دی گئی جیسے کہ اہل ثمود پر تھی۔(سورۃ ھود:۹۵)
- وہ ایک خوفناک دن کے عذاب میں گھر گئے۔(سورۃ الشعراء:۱۸۹)

یہی صورتِ حال بنی اسرائیل کے ساتھ بھی تھی۔ اللہ نے ان پر ذلت و مسکنت لازم کر دی کیونکہ وہ اللہ کے احکامات کو ماننے سے انکاری تھے، انبیاء کرام کی ناحق تذلیل کیا کرتے تھے، عصیان کے عادی تھے اور حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والے تھے۔(سورۃ البقرہ:۶۱)

نتیجہ یہ نکلا کہ:

- ان پر محتاجی لازم کر دی گئی۔(سورۃ آل عمران:۱۱۲)
- ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا گیا۔ وہ اس نصیحت سے فائدہ اٹھانا بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی۔(سورۃ المائدہ:۱۲۔۱۳)
- کلام الہٰی میں تحریف کی، جس کے نتیجے میں ان پر آسمان سے عذاب نازل ہوا۔

(سورۃ الاعراف:۱۶۲)

مندرجہ بالا تمام مثالیں اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ ان تمام اقوام نے اپنی مرضی و ارادہ سے ایسی راہیں منتخب کیں جو انہیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ نتیجے کے طور پر انہوں نے اپنے افعال کی سزا بھی پائی۔ اگر انسان کو ارادہ اور اختیار حاصل نہ ہو تو سزا اور جزا کے معنی ہی نہیں رہ جاتے۔ سزا اور جزا، ارادہ و اختیار سے مشروط ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے واضح طور پر مجبور اور صاحب ارادہ کو مساوی تسلیم نہیں کیا ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ یُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ یَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

"اللہ ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے جو دوسرے کے اختیار میں ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور ایک ایسا شخص ہے جس کو ہم نے اپنے ہاں سے مال طیب عطا فرمایا ہے وہ اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتا رہتا ہے۔ تو

کیا یہ دونوں اشخاص برابر ہیں ؟(ہر گز نہیں) الحمد للہ لیکن ان میں سے اکثر لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔" (سورۃ النحل:۷۵)

اس بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انسانوں پر جو بھی مشکلات / تکالیف یا پریشانیاں آتی ہیں وہ انسانوں کے اپنے گناہوں یا بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کبھی بھی، کسی پر بھی، کسی صورت ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ انسانوں کے اپنے اعمال بد ہوتے ہیں جو ان کے سامنے مختلف النوع مشکلات اور پریشانیوں کی شکل میں آتے ہیں۔

۶- قانون احترام آزادی

اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نے دین کے اختیار کی آزادی انسانوں کو عطا کر دی ہے۔ انسان اپنی مرضی سے جو چاہے دین منتخب کر سکتا ہے۔ اس آزادی یا خود مختاری کو ان الفاظ میں قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ

"دین (نظام حیات) میں کوئی جبر نہیں ہے۔" (سورۃ البقرہ:۲۵۶)

باالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو فکر و عمل کی مکمل آزادی عنایت کی ہے تاہم یہ آزادی مکمل مادر پدر نہیں ہے۔ یہ بنیادی طور پر دوراہوں میں سے ایک راہ کے انتخاب کی آزادی ہے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝

"ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے۔" (سورۃ البلد:۱۰)

اس آیت کریمہ کی رو سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر خیر اور شر کی دونوں راہیں کھول دی ہیں، اب یہ انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ ان میں سے کونسی راہ منتخب کرتا ہے۔ تاہم راہ کے انتخاب کے بعد یا باالفاظ دیگر تقدیرات کے انتخاب کے بعد ان تقدیرات کے نتائج بدلنے پر وہ بہر حال قادر نہیں ہے۔ اس حقیقت کا اعادہ (سورۃ الشمس:۸-۱۰) اور (سورۃ الیل: ۵-۱۰) میں بھی کیا گیا ہے۔

جہاں تک لفظ دین کا تعلق ہے اس کا مادہ د، ی، ن ہے۔ یہ بہت وسیع المعانی مادہ ہے۔ اس کی معانی میں غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت، آئین، قانون، نظم و نسق، فیصلہ، ٹھوس نتائج، جزا اور سزا اور بدلہ وغیرہ شامل ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک دین ہے تو اس سے مراد وہ نظام حیات یا آئیڈیالوجی ہے جو اسلام اپنے پیروکاروں کو پیش کرتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر وہ نظام مملکت ہے جو ایک اسلامی ریاست میں جاری ہوتا ہے۔ اس نظام میں اختیار مطلق کتاب اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔ تمام قواعد و ضوابط اور اصول و قوانین اسی کتاب سے مستنبط کیے جاتے ہیں۔ اس دین یا اس نظام کو ماننے والے ان اصولوں و قوانین پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی اطاعت کے نتائج سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور جو اسے تسلیم نہیں کرتے انہیں ان قوانین سے انحرافات کے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔

دین صرف اور صرف دل کی رضامندی کا سودا ہے، اسے بطیب خاطر ہی قبول کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ بھی اسلام / قرآن مجید کی تعلیمات کی حقانیت کو مانتے ہیں وہ اسے اختیار کرسکتے ہیں اور جو نہ مانیں یہ ان کا اپنا اختیار ہے۔ تاہم نہ مانے جانے کے نتائج سے ان کا فرار ممکن نہیں ہے۔

اس قانون کا ایک دوسرا پہلو

جہاں تک اس قانون کا تعلق ہے اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ نوع انسانی میں سے جو چاہے، جب اور جہاں چاہے اسلام کو اپنے دل کی رضا سے قبول کرسکتا ہے۔ یہ اسلام کی بہ حیثیت دین قبولیابی کا معاملہ ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ تمام تر معاملات زندگی میں سے کسی میں بھی، کسی بھی شخص پر، کسی بھی حوالے سے جبر نہیں کیا جاسکتا یعنی کسی بھی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں لامحالہ فرد کی ان آئینی یا قانونی ذمے داریوں کی بات نہیں کی جارہی ہے جو اس پر بہ حیثیت معاشرے کے ایک فرد کے عائد ہوتی ہیں، ان کی انجام دہی تو بہرحال طوعاً یا کرھاً لازمی ہے۔ لہذا ایسے قانونی معاملات جہاں قانون سب کے لیے یکساں اور مساوی ہو ان سے ہٹ کر کسی کاروباری، سماجی، حوالوں سے جبر کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے۔

۷- قانون تکریم انسانی

قرآن مجید فرقان حمید کے اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسانی کو عزت و تکریم عطا کی ہے یہ عزت و تکریم نہ صرف محض انسان ہونے کے ناطے ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جملہ مخلوقات میں سے اکثر پر انسان کو برتری عطا کی ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

"اور بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت دی۔ انہیں بحر اور بر میں سواریاں عطا کیں اور پاکیزہ چیزوں میں سے انہیں رزق دیا اور اپنی اکثر مخلوقات کے مقابلے میں ان پر فضل کیا (اور ان کے مقابلے میں انہیں) برتری دی۔"

(سورۃ بنی اسرائیل: ۷۰)

اس آیت کریمہ میں انسانی عزت و تکریم کے دو پہلو ہیں: اول یہ کہ انسان محض انسان ہونے کے ناطے قابل احترام ہے۔ یہ احترام انسان کو بہ حیثیت نوع عطا کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جب یہ کہا گیا کہ نوع انسانی کو عزت دی گئی تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ ایک اسلامی معاشرے میں عورتوں کو وہی عزت و احترام حاصل ہوتا ہے جو مردوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لہذا جنس کی بنیاد پر کسی قسم کی کوئی تفریق روا نہیں رکھی جاسکتی۔

دوسری طرف یہ عزت و احترام اس امر کا بھی متقاضی ہے کہ پیشے، سماجی رتبے، دولت یا جائیداد یا کسی بھی دیگر بنیاد پر کسی کو ذلیل نہیں کیا جاسکتا۔ سب کی عزتِ نفس کی یکساں اہمیت ہے اور کسی بھی صورت میں، کسی بھی بنیاد پر بالخصوص پیشے کی بنیاد پر کسی سے تفریق روا نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ ایک ایسا حق ہے جو قرآن مجید نے پوری نوع انسانی کو دیا ہے اور جو حق قرآن مجید کا عطا کردہ ہو اسے کوئی کیسے اور کس طرح چھین سکتا ہے؟

دولت، نسب یا دنیاوی جاہ و جلال تکریم کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ لہذا کوئی بھی غریب محض اپنی غربت کی بنیاد پر انسانی حقوق سے محروم نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مابین اس قسم کے کسی معیار کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ صرف تقویٰ کو معیار بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اس کے درجات زیادہ بلند ہیں جو متقی ہے یعنی

احکامات الٰہی کا زیادہ سے زیادہ پابند ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

"اے نوع انسانی! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور کنبے اور قبیلے بنا دیئے۔ اس لیے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے، بے شک اللہ جاننے والا دانا ہے۔ (سورۃ الحجرات: ۱۳)

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں اس قسم کا کوئی نظام موجود نہیں ہو سکتا جس میں کسی بھی حوالے سے کسی بھی انسان کی کسی بھی قسم کی بلاواسطہ یا بالواسطہ توہین کا پہلو نکلتا ہو۔

متذکرہ بالا آیت کریمہ کے حوالے سے دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تخلیق کردہ منجملہ تمام مخلوقات میں سے ایک بہت بڑی تعداد کے اوپر انسانوں کو فضیلت دی ہے۔

جہاں تک لفظ فضل کا تعلق ہے اس کا مادہ ف، ض، ل ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کے متوسط سے زائد ہونے کے ہیں۔ اس کا استعمال اچھے معنوں میں ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ مادہ فضیلت دینے کے معنوں میں آیا ہے۔ اس کے عمومی معنی معاشی فارغ البالی اور خوش حالی کے ہیں۔ ممکنہ طور پر یہاں بھی فضل سے مراد معاشی خوشحالی ہو سکتی ہے۔ اس امر کی تصدیق خود اس آیت کریمہ کے ابتدائی حصے سے بھی ہو رہی ہے جہاں نوع انسانی کو مختلف سواریاں دینے کی بات کی گئی جن کا بیشتر حالات میں استعمال معاشی مقاصد کے لیے ہی ہوتا ہے پھر اس کے بعد واضح طور پر کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو طیب اشیاء میں سے رزق عطا کیا۔ اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے فضل عطا ہونے سے مراد معاشی فضل یا خوشحالی ہے۔ اس کے ساتھ نوع انسانی کو دیگر مخلوقات میں سے اکثر کے مقابلے میں عزت عطا ہوئی ہے۔

**

باب۔ 3

اسلام بہ حیثیت دین: بنیادی قوانین

جہاں تک موجودہ باب کا تعلق ہے اس میں ان قوانین کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کا تعلق اسلام کے بہ حیثیت دین ہونے سے ہے۔ باالفاظ دیگر وہ لوگ جو اسلام کو بہ حیثیت دین قبول کرتے ہیں اور اس پر مکمل طور پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ یہ پورا عمل کن اصولوں اور قوانین کے تحت ہے اور اسلام کو بہ حیثیت دین اختیار کرنے کے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں؟ یہ سارا عمل بھی چند مخصوص قوانین کے تابع ہے۔ ان قوانین کا تجزیہ زیر نظر باب کا موضوع ہے۔

اس حوالے سے سب سے پہلا قانون یہ ہے کہ جو بھی لوگ اسلام کو بہ حیثیت دین قبول کرنا چاہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے بہ حیثیت کل قبول کریں اور آدھا تیتر اور آدھا بٹیر کی پالیسی اختیار نہ کریں، اسے قانونِ تسلیم کلی کا نام دیا گیا ہے۔ اسلام کی قبولیابی کے بعد اسلام کا پہلا مطالبہ اپنے پیروکاروں سے ایمان اور اعمال صالحہ کا ہے، جس کا لازمی نتیجہ دنیاوی اور اخروی فلاح ہے۔ اس حقیقت کو قانون فلاح کے نام سے شامل بحث کیا گیا ہے۔ اسلام کا ایمان اور اعمال صالحہ کے بعد دوسرا سب سے بنیادی مطالبہ عدل واحسان کا ہے۔ اس حقیقت کو قانونِ عدل و احسان کے نام سے بطور تیسرے قانون زیر بحث لایا گیا ہے۔ اگر

ایک مسلمان ایمان، اعمال صالحہ اور عدل و احسان پر کاربند ہوتا ہے تو اس کا لامحالہ نتیجہ از روئے قرآن استخلاف فی الارض اور طمانیت و سکون ہے۔ ان دونوں حقائق کو قانون استخلاف فی الارض اور قانون طمانیت و سکینت کے عنوان سے بالترتیب چوتھے اور پانچویں قانون کی حیثیت دی گئی ہے۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا چھٹا قانون، تشکر نعمت ہے جو اس امر کا متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو بھی نعمتیں عطا کرے ان کا شکر لازمی ہے، ورنہ وہ نعمتیں واپس لے لی جاتی ہیں۔ ان قوانین کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

۱- قانون تسلیم کُلی

اللہ کے قوانین کی اطاعت سے ان کے بھرپور اور مکمل نتائج صرف اسی وقت ہی حاصل ہوسکتے ہیں جب ان قوانین پر بحیثیت کُل عمل کیا جائے، لیکن اگر آدھا تیتر اور آدھا بٹیر والی صورتحال ہو تو ان قوانین کے بھرپور نتائج بہر حال حاصل نہیں ہو سکیں گے، یہ مظہر، قانون تسلیم کلی کہلاتا ہے۔ قرآن مجید میں اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

"اے اہل ایمان! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو! وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔" (سورۃ البقرہ:۲۰۸)

یہ آیت کریمہ اسلام کے حوالے سے ایک بالکل بنیادی قانون کی عکاس ہے، جس کے تحت جو بھی اسلام کو بہ حیثیت دین قبول کرتا ہے اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ اس دین کے تمام تقاضوں کو کماحقہ پورا کرے اور اس میں کسی قسم کی رعایت یا استثنیٰ کا طالب نہ ہو۔ اور نہ یہ کوشش کی جائے کہ دین کے کچھ حصوں پر تو عمل کیا جائے اور کچھ کا انکار کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر دین اسلام کو اس کی مکمل شرائط کے ساتھ قبول کرنا لازمی ہے۔ ایسے لوگ جو اپنے لیے چند عبادات یا رسوم کا آسان نظام اپنائیں اور جہاں مشکلات ہوں یا محنت اور خرچ ہو اس نظام سے بچنے کی کوشش کریں ان کا انجام انتہائی بُرا ہو گا جیسا کہ بنی اسرائیل کے حوالے سے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔

اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَتَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾

"کیا تم (اللہ کی) کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ سو تم میں سے جو بھی ایسا کرے اس کی سزا اس کے ماسوا کچھ نہیں کہ اسے دنیا کی زندگی میں ذلت ورسوائی کا سامنا ہو اور قیامت کے دن انہیں سخت ترین عذاب کی طرف پھیر دیا جائے گا اور اللہ تمہارے افعال سے لاعلم نہیں ہے۔" (سورۃ البقرہ:۸۵)

اس آیت کریمہ کی رو سے ایسے لوگوں کا انجام جو دین کے ایک حصے پر تو عمل کریں اور دوسرے کو چھوڑ دیں بدترین دنیاوی رسوائی بتایا گیا ہے۔ مسلم اُمہ کی موجودہ حالت اس قرآنی قانون کی سچائی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اُمت کی موجودہ رسوائی کی بہت بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نے بہ حیثیت اُمہ، دین کے ایک حصے کو ہی مکمل دین سمجھ لیا ہے اور یہ حصہ صرف چند عباداتی رسوم پر مشتمل ہے باقی عملی زندگی کے تمام معاملات ہم نے قصر پر چھوڑ رکھے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دین اسلام صرف عبادات کے ایک رسوماتی دائرے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس میں بھی طرفہ تماشہ یہ ہے کہ عوام الناس کی اکثریت عبادات سے بھی غافل ہے۔ گویا اسلام کے جس حصے کو مکمل دین کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اس حصے پر بھی عمل درآمد نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اُمت کی موجودہ رسوائی پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

جہاں تک اس کی اصلاح کا تعلق ہے، اس کا جواب دو مراحل پر مشتمل حکمت عملی کے تحت ہے۔ پہلا مرحلہ ظلم سے اجتناب اور دوسرا اعمال صالحہ کا ہے۔ ان مراحل کی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

ظلم سے اجتناب

ظلم کے حوالے سے قرآن مجید نے دنیا کا سب سے اہم ترین اصول محض چار الفاظ میں اس طرح بیان کر دیا ہے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴿۲۷۹﴾

"نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہو گا۔" (سورۃ البقرہ:۲۷۹)

اس وقت اگر پوری اُمت مسلمہ کا جائزہ لیا جائے تو غور کیجیے دنیا کے کم و بیش ہر خطے میں ان پر بہ لحاظ شدت کم یا زیادہ بہر حال ظلم ہو رہا ہے۔ کہیں یہ ظلم خون مسلم کی ارزانی کی شکل میں ہے تو کہیں یہ وسائل کے بے دریغ استحصال کی شکل میں ہے تو کہیں کسی اور شکل میں۔ اب اگر مندرجہ بالا چار الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو بات قطعی صاف ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیئے ظلم ہمیشہ ظالم پر ہوتا ہے۔ مسلم اُمہ اپنے اندر مختلف النوع اشکال میں ایک دوسرے پر کھلا کھلا ظلم کر رہی ہے۔ اس ظلم کی کئی اشکال ہمارے اردگرد موجود ہیں۔ مثال کے طور پر گھروں کے اندر خواتین پر ظلم، وڈیرے، چوہدری، خان اور سردار کی شکل میں کاشتکاروں پر بے انتہا مظالم، افسروں کے ماتحتوں پر مظالم، بیوروکریسی کے مظالم، چوری، ملاوٹ، لوٹ مار، کرپشن کی شکل میں مظالم، جنسی بے راہ روی کی شکل میں مظالم، میرٹ کا کھلے عام قتل، اقربا پروری، ٹیکس، چوری، اسمگلنگ۔ غرضیکہ ایک طویل فہرست ہے جو اس حوالے سے پیش کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے جب ایک قوم اس وسیع پیمانے پر ظلم کرے گی تو اللہ کے قانون کے تحت اس پر بھی ظلم لازم ہو جائے گا۔ ظلم کا بدلہ ظلم ہے۔ یاد رکھیئے یہ قرآن کا قانون ہے کوئی مذاق نہیں۔ قرآن نے کہا ہے: "نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہو گا۔" ہم بہ حیثیت اُمہ، ظلم کر رہے ہیں لہذا اس کے لازمی نتیجے سے فرار کیسے ممکن ہے؟

جہاں تک اس کی اصلاح کا تعلق ہے وہ حل بھی قرآن مجید میں موجود ہے اور وہ ہے ایمان اور اعمال صالحہ۔ ان دونوں افعال میں سے اگر صرف ثانی الذکر موجود ہو تو بھی استخلاف فی الارض ممکن ہے۔ تاہم ایسا استخلاف صرف دنیا تک محدود ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ لیکن اگر یہ دونوں امور موجود ہوں تو دنیا اور آخرت دونوں سنور جاتی ہیں۔ لہذا مسلم اُمہ کو اپنی موجودہ زبوں حالی سے اگر باہر نکلنا ہے تو اسے پہلے اپنے اندر ظلم کو بند کرنا ہو گا۔ اگلے مرحلے میں ایمان میں افزودگی لازمی ہے اور حتمی مرحلے میں ان تمام افعال کو اپنانا ہو گا جن کا تذکرہ اعمال صالحہ کے تحت آگے کیا جارہا ہے۔ یہ اس مسئلے کا قرآنی حل ہے، کسی فانی انسان کی رائے نہیں۔ لہذا جب تک یہ اُمت قرآن سے

رجوع نہیں کرے گی اس کے احکامات کی پابند نہیں ہوگی یہ سب کچھ یونہی ہوتا رہے گا، کیونکہ:

گر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

۲- قانونِ فلاح

از روئے قرآن ایسے لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ انجام دیئے انہیں دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر فلاح حاصل ہوگی، اسے قانون فلاح کا نام دیا گیا ہے۔ یہ قانون بنیادی طور پر تین اصطلاحات کا حامل ہے: اول ایمان، دوم اعمال صالحہ اور سوم فلاح۔ ان تینوں اصطلاحات کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

ایمان

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے اس سے مراد پانچ چیزوں پر دل کی گہرائیوں سے ایمان لانا ہے۔ یہ پانچ عناصر: اللہ پر، اس کے رسولوں پر، اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتابوں پر، فرشتوں پر اور روزِ قیامت پر ایمان ہے۔ اس کی تصدیق مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے ہوسکتی ہے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا

"اے اہل ایمان! اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسول (ﷺ) اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول (ﷺ) پر اتاری ہے اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے اس نے نازل کی ہیں ایمان لاؤ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے، اس کے فرشتوں سے، اس کی کتابوں سے اور اس کے رسولوں سے اور قیامت کے دن سے انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔" (سورۃ النساء:۱۳۶)

اس حقیقت کا اعادہ (سورۃ البقرہ:۱۷۷) میں بھی کیا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ

"نیکی یہ نہیں کہ تم مغرب کی طرف منہ کرتے ہو یا مشرق کی طرف بلکہ درحقیقت اچھا شخص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان رکھتا ہو۔" (سورۃ البقرہ:۱۷۷)

اعمال صالحہ

ایمان کے بعد اگلا مرحلہ اعمال صالحہ کا ہے جو ایمان کے ساتھ ایک لازمی شرط ہے اور اس کے بغیر ایمان کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنت کا وعدہ ایمان اور اعمال صالحہ سے مشروط ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ

"اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیئے ان کے لیے جنت کی خوش خبری ہے۔" (سورۃ البقرہ:۲۵)

سورۃ البقرہ میں ایک مقام پر کہا گیا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کیئے وہ جنتی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔" (سورۃ البقرہ:۸۲)

جنت کا وعدہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر ایمان اور اعمال صالحہ سے مشروط ہے مثلاً (سورۃ النساء: ۵۷اور ۱۲۲)، (سورۃ التوبہ:۵ اور ۱۰)، (سورۃ الشوریٰ:۷)، (سورۃ الجن:۹)، (سورۃ المؤمنون:۱۴)، (سورۃ الکہف:۲-۳)، (سورۃ الممتحنہ:۱۹)، (سورۃ طٰہٰ:۷۵-۷۶) وغیرہ۔

جہاں تک ان اعمال صالحہ کا تعلق ہے جنہیں روز آخرت کامیابی کی اساس بتایا گیا ہے ان کا بیان قرآن مجید میں بالواسطہ انداز میں دیا گیا ہے یعنی انہیں مومنین کی خصوصیات کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک مومن جب اعمال صالحہ انجام دیتا ہے تو اس کے لیے

قرآن مجید صالحین یا متقین کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس بنیاد پر قوم صالحین سے مراد مومنین کا ہی گروہ ہے۔ تاہم اس فرق کے ساتھ کہ ایک خاص تناظر میں مومنین / مسلمین اعتقادی مرحلہ ہے اور صالحین اس کی عملی شکل، جنہیں قرآن مجید میں متقین بھی کہا گیا ہے اور کہیں صرف اہل ایمان کہا گیا ہے۔ یہاں توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کے بیان کے وقت مختلف افعال کے حوالے سے کبھی قرآن مجید میں اہل ایمان، کبھی مومن اور کبھی متقین کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ تاہم مقصد بہر حال ہر جگہ ان افعال کا ابلاغ ہی ہے جنہیں از روئے قرآن اعمال صالحہ کہا جاتا ہے۔

اعمال صالحہ میں شامل افعال

ان افعال کو کسی باقاعدہ فہرست کی شکل میں قرآن مجید میں نہیں دیا گیا بلکہ انہیں مومنین کی صفات کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ افعال چونکہ یا تو توازن کو مستحکم کرتے ہیں یا بحال کرتے ہیں اسی وجہ سے مومنین کو قرآن مجید میں محسنین (توازن قائم کرنے والے) بھی کہا گیا ہے۔ یہ اعمال از روئے قرآن مجید مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اللہ کا خوف یا اس کا تقویٰ اختیار کرنا۔ (سورۃ الانبیاء:۴۹)، (سورۃ التوبہ: ۱۱۹) اور (سورۃ الحشر:۱۸)

۲- اللہ پر توکل کرنا۔ (سورۃ الانفال:۲)

۳- اللہ کا کثرت سے ذکر کرنا۔ (سورۃ الاعراف:۲۰۵)، (سورۃ البقرہ:۱۵۲) اور (سورۃ الاحزاب:۴۲)

۴- اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت۔ (سورۃ الانفال:۱۔۳)، (سورۃ النور:۵۱) اور (سورۃ المائدہ:۹۲)

۵- کتاب اللہ کی کماحقہ اطاعت (سورۃ البقرہ:۱۲۱)، (سورۃ الزمر:۵۵)

۶- حدود اللہ کی اطاعت (سورۃ التوبہ:۱۱۲)

۷- اللہ کی اطاعت میں سختی / کمالِ اطاعت (سورۃ البقرہ:۱۶۵)

۸- نظام صلوٰۃ (اسلامی ریاست کا نظام) کا قیام، ادائیگی زکوٰۃ کا حکم اور برائیوں سے روکنا۔ (سورۃ الحج:۴۱)

۹- عدل اور احسان (سورۃ النحل:۹۰)

۱۰- اللہ کی راہ میں جہاد (سورۃ العنکبوت:۶۹)، (سورۃ الحج:۷۸) اور (سورۃ النساء:۷۶)

۱۱- باہم صلح سے رہنا (سورۃ الانفال:۱)

۱۲- باہم رحمدل لیکن کفار کے لیے برہنہ شمشیر (سورۃ الفتح:۲۹)

۱۳- جائز ذرائع سے آمدنی کا حصول (سورۃ ھود:۸۶)

۱۴- ربا (ہر قسم کے اثاثے کا کسی بھی شکل میں حاصل ہونے والا معاوضہ) سے مکمل اجتناب (سورۃ البقرہ:۲۷۹)

۱۵- اللہ کی یاد سے غافل نہ ہونا (سورۃ المنافقون:۹)

۱۶- انفاق (مال و دولت سمیت تمام اشیاء کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا (سورۃ البقرہ:۱۷۷)، (سورۃ الذاریات:۱۹)، (سورۃ الروم:۳۸)، (سورۃ بنی اسرائیل:۲۶)، (سورۃ الانعام: ۱۴۱)، (سورۃ البقرہ:۲۱۹)، (سورۃ الحدید:۷)

۱۷- یتیم، مسکین اور اسیروں کی نگہداشت (سورۃ الدھر:۸)

۱۸- اللہ کے فضل اور رضا کی جستجو (سورۃ الجمعہ:۱۰)، (سورۃ الفتح:۲۹)

۱۹- ہر قسم کے ظاہری اور باطنی گناہوں سے اجتناب (سورۃ الاعراف:۳۳)، (سورۃ الانعام:۱۲۰)

۲۰- اللہ سے مغفرت کا حصول (سورۃ آل عمران:۱۳۳)

۲۱- اللہ کے حضور توبہ کرنا، راہ حق میں سفر کرنا، رکوع و سجود کرنا اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنا (سورۃ الفرقان:۷۱)، (سورۃ التحریم:۸) اور (سورۃ التوبہ:۱۱۲)

۲۲- نصیحت قبول کرنا (سورۃ الذاریات:۵۵)

۲۳- صرف اور صرف اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھنا (سورۃ الانعام:۱۱۹)

۲۴- آزمائش کے وقت ثابت قدم رہنا (سورۃ التغابن:۱۵)، (سورۃ العنکبوت:۲) اور (سورۃ البقرہ:۱۵۵)

۲۵- کفران نعمت نہ کرنا اور عہد کی پاسداری (سورۃ الرعد:۲۰)، (سورۃ المائدہ:۷) اور (سورۃ الحدید:۸)

۲۶- اللہ پر پختہ ایمان جو شک و شبہ سے ماوراہو (سورۃ الحجرات:۱۵)

۲۷- خوف و حزن سے محفوظ (سورۃ یونس:۶۲۔۶۴)، (سورۃ البقرہ:۳۸)

۲۸- باہمی اخوت (سورۃ الحجرات:۱۰)،(سورۃ التوبہ:۷۱)

۲۹- غور و فکر، فہم و تدبر پر مبنی دلائل سے استدلال (سورۃ یوسف:۱۰۸)

۳۰- سچی گواہی دینا اور لغویات سے اجتناب (سورۃ النساء:۱۳۵)،(سورۃ الفرقان:۷۲)

۳۱- شہادت نہ چھپانا (سورۃ البقرہ:۱۴۰)

۳۲- صاف سیدھی بات کرنا (سورۃ الاحزاب:۷۰)

۳۳- پست نفسانی خواہشات پر انضباط (سورۃ النازعٰت:۴۰)

۳۴- عذاب آخرت کا خوف (سورۃ الدھر:۷،۱۰)،(سورۃ الانبیاء:۴۹)

۳۵- تکبر سے اجتناب (سورۃ السجدہ:۱۵)

۳۶- امانتوں کی پاسداری (سورۃ الانفال:۲۷)،(سورۃ المعارج:۳۲)

۳۷- ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیازی (سورۃ الدھر:۹)

۳۸- بُخل سے اجتناب (سورۃ الحشر:۹)

۳۹- اپنی ضروریات پر دوسروں کو ترجیح دینا (سورۃ الدھر:۸)

۴۰- معافی اور درگذر (سورۃ الشوریٰ:۴۰)

۴۱- اسراف و تبذیر سے بچنا (سورۃ الفرقان:۶۷)

۴۲- ناپ تول پورا رکھنا (سورۃ الشعراء:۱۸۱)

۴۳- برائی کو بھلائی سے ٹالنا (سورۃ الرعد:۲۲)

۴۴- راہ حق میں صبر سے کام لینا (سورۃ الرعد:۲۲)

۴۵- اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے مخالف اور منکرِ قیامت سے احتراز (سورۃ المائدہ:۸۱)، (سورۃ المجادلہ:۲۲)

۴۶- قیام صلوٰۃ اور ادائیگی زکوٰۃ (سورۃ البقرہ:۳)،(سورۃ الشوریٰ:۳۸)،(سورۃ المزمل:۲۰)

۴۷- راتوں کو قیام و سجود کرنا (سورۃ الذاریات:۱۷۔۱۸)،(سورۃ السجدہ:۱۶) اور (سورۃ الفرقان:۶۴)

۴۸- عصمت کی حفاظت (سورۃ المعارج:۲۹)،(سورۃ النور:۳۰) اور (سورۃ المؤمن:۵)

۴۹- ناحق کسی کی جان نہ لینا (سورۃ النساء:۹۲)

۵۰- باہم تمسخر، بدظنی، عیب جوئی اور بدگمانیوں سے پرہیز کرنا (سورۃ الحجرات:۱۱۔۱۲)

۵۱- پاکیزگی کے دعووں سے اجتناب (سورۃ النجم:۳۲)
۵۲- کسی سے بھی کینہ نہ رکھنا (سورۃ الحشر:۱۰)
۵۳- واجبات کی مکمل ادائیگی (سورۃ الدھر:۷)
۵۴- قانون کا مکمل اطلاق (سورۃ النور:۲)
۵۵- تکبر، اتراہٹ سے اجتناب (سورۃ القمان:۱۸)
۵۶- میانہ روی اور ہلکی آواز میں گفتگو (سورۃ القمان:۱۹)
۵۷- لوگوں سے اچھے طریقے سے گفتگو کرنا (سورۃ البقرہ:۸۳)
۵۸- قول و فعل کے تضاد سے بچنا (سورۃ الصف:۲-۳)
۵۹- شیطان کے تسلط سے آزاد (سورۃ النحل:۹۹)
۶۰- دنیا سے بے نیاز نہ ہونا (سورۃ القصص:۷۷)
۶۱- ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور بے حیائی کے تمام کاموں سے مکمل بچنا (سورۃ الانعام:۱۵۱)
۶۲- اللہ کے لیے جینا مرنا (سورۃ الانعام:۱۶۲)
۶۳- تمام کاموں کو باہمی مشاورت سے انجام دینا (سورۃ الشوریٰ:۳۸)
۶۴- آیات الٰہی کے سامنے سجدہ ریز ہونا (سورۃ السجدہ:۱۵)
۶۵- مرتے دم تک مسلمان رہنا (سورۃ آل عمران:۱۰۲)
۶۶- اللہ سے مغفرت طلب کرنا (سورۃ آل عمران:۱۶)
۶۷- صبر اور تقویٰ (سورۃ آل عمران:۱۸۶)
۶۸- اللہ کی آیات (احکامات) کو معمولی دنیاوی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہ بنانا (سورۃ آل عمران:۱۹۹)
۶۹- خود بھی ثابت قدم اور دوسروں میں بھی استقامت پیدا کرنا (سورۃ آل عمران:۲۰۰)
۷۰- ہمہ وقت جہاد کے لیے تیار (سورۃ آل عمران:۲۰۰)
۷۱- سچ ہی کی گواہی دینا (سورۃ الحدید:۱۹)
۷۲- اللہ پر کامل توکل رکھنا (سورۃ الانفال:۲)
۷۳- اپنی جان اور مال کو خدا کے ہاتھ بیچ دینا (سورۃ التوبہ:۱۱۱)
۷۴- توبہ کرنا، بری باتوں سے مجتنب رہنا اور حدود اللہ کی حفاظت (سورۃ التوبہ:۱۱۲)
۷۵- نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا (سورۃ آل عمران:۱۰۴)

۷۶- خدا کے ساتھ کیا گیا عہد پورا کرنا (سورۃ الرعد:۲۰)

۷۷-رشتوں، تعلقات کو برقرار رکھنا (سورۃ الرعد:۲۱)

۷۸- ناواقفوں کی سلامتی کی آرزو کرنا (سورۃ الفرقان:۶۳)

۷۹- جہنم کے عذاب سے خوف زدہ رہنا (سورۃ الفرقان:۶۵)

۸۰- ظالم کی گردن مروڑ دینا (سورۃ الشعراء:۲۲۷)

۸۱- ظلم کا صرف بقدرے ظلم بدلہ لینا (سورۃ الشوریٰ:۳۹)

۸۲- برائی کو معاف کر دینا (سورۃ الشوریٰ:۴۳)

۸۳- ناحق بغاوت اور سرکشی نہ کرنا (سورۃ الشوریٰ:۴۲)

۸۴- باہم مذاق نہ اڑانا، نہ عیب جوئی کرنا اور نہ برے القاب دینا (سورۃ الحجرات:۱۱)

۸۵- کفار کو دوست نہ بنانا (سورۃ آل عمران:۲۸)

۸۶- صاف، سیدھی اور دوٹوک بات کرنا (سورۃ الاحزاب:۷۰)

متذکرہ بالا اعمال صالحہ یقیناً کوئی حتمی نہیں ہیں۔ قرآن مجید پر تدبر سے ان میں اضافہ عین ممکن ہے۔

اس بنیاد پر از روئے قرآن مومن / متقی / صالح / محسن وہ شخص کہلائے گا جو ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ انجام دے یعنی مومن وہ شخص ہے جو متذکرہ بالا خصوصیات سے علیٰ حد بشریت متصف ہو۔

ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ دنیاوی اور اخروی کامیابی ہے

از روئے قرآن جو لوگ بھی اپنی زندگی متذکرہ بالا دونوں شرائط یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کے تحت بسر کرتے ہیں انہیں دنیاوی اور اخروی دونوں کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اس امر کی ضمانت قرآن مجید میں ان الفاظ میں دی گئی ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْــــًٔا ۭ وَمَنْ

كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴿۵۵﴾

"اللہ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور اعمال صالحہ کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں غلبہ عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو عطا کیا تھا اور جو دین اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے وہ ان کے لیے اسے مضبوطی سے قائم کردے گا اور ان کی حالت کو خوف کے بعد حالت امن میں تبدیل کردے گا۔ وہ میری اطاعت کریں گے (اور) کسی کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو لوگ اس کے بعد بھی انکار کریں گے وہ حدود فراموش لوگوں میں سے ہوں گے۔" (سورۃ النور:۵۵)

اس فضل میں ہر طرح کی نعمتیں شامل ہیں جن میں معاشی فارغ البالی سرِ فہرست ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ﴿۶۶﴾

"اگر یہ لوگ تورات اور انجیل اور ان کے پاس جو کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ان کے پورے پابند رہتے تو یہ لوگ اپنے اوپر سے اور نیچے سے کھاتے۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے اعمال برے ہیں۔"

(سورۃ المائدہ:۶۶)

انہیں نہ صرف اس دنیا میں اللہ کی نعمتیں عطا ہوتی ہیں بلکہ ان کی آخرت بھی سنور جاتی ہیں:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴿۸۲﴾

"جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیئے وہ جنتی ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔" (سورۃ البقرہ:۸۲)

بالفاظ دیگر ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ کامیابی و کامرانی ہے۔ نہ صرف متذکرہ بالا نتائج بلکہ قرآن مجید میں دیگر کئی مقامات پر بھی ان دونوں افعال کے اور بہترین نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔

۳- قانون عدل و احسان

اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے عدل و احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ لہٰذا انسانوں بالخصوص مومنین کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عدل اور احسان سے کام لیں۔ اس حوالے سے ان دونوں الفاظ عدل اور احسان پر تدبر لازمی ہے۔

جہاں تک لفظ عدل کا تعلق ہے اس کا مادہ ع، د، ل ہے۔ اس کے معنی برابر ہونا، ہم وزن ہونا، اعتدال اور تناسب و توازن کے ہیں۔ یہ اعتدال اشیاء کی کمیت اور کیفیت دونوں میں ہوتا ہے۔ توازن کے معنی میں یہ مادہ (النحل:۹۰) میں آیا ہے۔ کسی چیز کے برابر کا معاوضہ بھی عدل کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معنی فدیہ کے بھی ہیں۔ ان معنوں میں یہ مادہ (سورۃ البقرہ:۴۸) اور (سورۃ الانعام:۷۰) میں آیا ہے۔ یہ بیک وقت دو متضاد معنوں یعنی ہموار ہونا اور ٹیڑھا ہونا کے لیے بھی آتا ہے۔ ٹیڑھے ہونے یا راہ سے ہٹ جانے کے مفہوم میں (سورۃ النمل:۶۰) میں آیا ہے۔

اس ضمن میں دوسرے لفظ احسان کا مادہ ح، س، ن ہے۔ اس کے معنی اعضا کے صحیح تناسب و توازن کے ہیں۔ یہ سوء یا فساد کی ضد ہے جس کے معنی عدم توازن کے ہیں۔ اس کے معنی کسی بگڑے ہوئے توازن کو درست کرنے کے بھی ہیں۔ اس عدم توازن کی اصلاح داخلی بھی ہو سکتی ہے اور خارجی بھی۔ داخلی توازن کی اصلاح سے مراد انسان کی اپنی ذات کے توازن کی اصلاح ہے جبکہ خارجی توازن کی اصلاح سے مراد ماسوا اپنی ذات کے توازن کے، کسی دوسرے فرد یا معاشرے کے کسی بھی قسم کے عدم توازن کی اصلاح ہے۔ احسان بنیادی طور پر عدل سے اگلا مرحلہ ہے۔ عدل یہ ہے کہ جس کے ذمے جو ذمے داری ہے اس کو کماحقہ انجام دینا، جبکہ احسان سے مراد آگے بڑھ کر واجب سے زیادہ امور کی انجام دہی ہے۔ قرآن مجید میں محسنین کی اصطلاح متعدد مقامات پر آئی ہے، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نہ صرف یہ کہ زندگی اعتدال کے ساتھ گذارتے ہیں بلکہ دوسروں کے لیے واجبات سے زیادہ ادا کرتے ہیں۔ (سورۃ یوسف:۳۶) میں محسنین سے مراد وہ لوگ لیے گئے ہیں جو عالم ہیں۔ قرآن مجید میں حسنات کا لفظ زندگی کی منجملہ تمام نعمتوں کے لیے آیا ہے۔ مثلاً (سورۃ الاعراف:۱۳۱)۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء (ناموں) کو الاسماء الحسنیٰ کہا گیا ہے۔ (سورۃ الحشر:۲۴) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات

میں اس کی تمام ترصفات اپنے کامل ترین تناسب کے ساتھ مجتمع ہیں۔ اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیں۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

"اور اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ سے اچھا رنگ کس کا ہو گا؟ ہم تو اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔" (سورۃ البقرہ:۱۳۸)

باالفاظِ دیگر انسانوں کو یہ کہا جا رہا ہے کہ جس طرح اللہ کی ذات میں اس کی تمام ترصفات احسن ترین تناسب کے ساتھ مجتمع ہیں لہذا انسانوں کو بھی چاہیے کہ وہ بھی علیٰ حد بشریت اسی رنگ میں رنگ جائیں۔ اس امر کا اثبات آیت کے آخری الفاظ سے بخوبی ہو رہا ہے جہاں اس رنگ میں رنگنے کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی گئی کہ: "ہم (مومن) وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں۔" باالفاظ دیگر اللہ کے قوانین کی کامل اطاعت کے نتیجے میں انسان مکمل طور پر تبدیل ہو جاتا ہے اور اس اطاعت کی سطح جتنی بلند ہو گی اس کے نتیجے میں انسان میں اسی تناسب سے اعتدال و توازن پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ انسب ترین اعتدال و توازن رب ذوالجلال کی ذات کا خاصہ ہے۔ اس استدلال کو تقویت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ آیت میں آنے والے لفظ صبغۃ کا مادہ ص، ب، غ ہے۔ اس کے معنی جہاں ایک طرف رنگ کے ہیں تو دوسری طرف اس کے معنی تغیر و تبدل اور تبدیلی پیدا کرنے کے بھی ہیں۔ باالفاظ دیگر ایسا تغیر و تبدل جو اللہ کی ذات کے احسن ترین تناسب کا بشری حد تک عکس ہو۔

لہذا اس قانون کی رو سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اعتدال پر چلنے والوں کو پسند کرتا ہے اور انسانوں بالخصوص اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ممکنہ حد تک اعتدال و توازن سے کام لیں۔

عدل سے مراد جیسا کہ عرض کیا گیا توازن ہے تاہم اس حوالے سے اس قانون کا ایک دوسرا اور بہت اہم ترین پہلو یہ بھی ہے کہ از روئے قرآن توازن، عدم توازن کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ کوئی بھی گناہ خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ بنیادی طور پر عدم توازن کا دوسرا نام ہے یہ عدم توازن گناہ کرنے والے کی شخصیت میں بھی رونما ہوتا ہے اور کم یا بیش معاشرتی / معاشی / سماجی توازن کو بھی درھم

برھم کرتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس کوئی بھی نیکی خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ نیکی کرنے والے کی ذات اور خود معاشرے کے مختلف النوع توازن کو بہتر کرتی ہے۔ از روئے قرآن اگر انفرادی اور اجتماعی سطح پر برائیوں / گناہوں یا ظلم کے نتیجے میں عدم توازن پیدا ہو گیا ہے تو اسے نیکیوں کی انجام دہی کے ذریعے دوبارہ بحال کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے اہم ترین قرآنی قانون یہ ہے:

الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ط

"نیکیاں، گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔" (سورۃ ھود:۱۱۴)

قرآن مجید فرقان حمید کے یہ محض تین الفاظ انسانی زندگی کی بہت بنیادی اور ٹھوس حقیقت کے ترجمان ہیں۔ اس قانون کی رو سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر موجود عدم توازن کو دور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ توازن پیدا کیا جائے، جس کے نتیجے میں یہ عدم توازن خود بخود ختم ہو جائے گا۔ باالفاظ دیگر گناہوں کے خاتمے کا طریقہ زیادہ سے زیادہ نیکیوں کا کرنا ہے۔ اس کے نتیجے میں گناہوں کے ضرر رساں اثرات کا خاتمہ نیکیوں کے ذریعے ممکن بنا دیا گیا ہے۔

اندازہ کیجئے قرآن مجید کے یہ محض تین الفاظ انسانیت کو کتنے بڑے طوق سے نجات دلواتے ہیں۔ غور کیجیے عیسائیت نے کہا کہ آدم سے جو گناہ ہوا اس کی کوئی تلافی ممکن نہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے معاذاللہ اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا جس نے مصلوب ہو کر پوری انسانیت کا کفارہ ادا کیا۔ اب جو اس کفارے پر ایمان لائے گا اس کی نجات ہو جائے گی اور جو ایمان نہیں لائے گا اس کی نجات ممکن نہیں یعنی گناہ کے خاتمے یا اس کو دور کرنے کا کوئی تصور ان کے پاس نہیں۔

ہندومت اس حوالے سے انتہا پر چلا گیا، یہاں بھی گناہوں کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ ان کے نزدیک انسان اس دنیا میں جو گناہ کرتا ہے اس کا نتیجہ اسے اگلے جنم میں بھگتنا پڑتا ہے، یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے تاوقتیکہ انسان کو مُکتی (نجات) نہ مل جائے۔ باالفاظ دیگر دنیا کے ان دونوں بڑے مذاہب کے پاس گناہ کے خاتمے یا اس کے ضرر رساں اثرات سے تحفظ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جبکہ اس کے برعکس اسلام کا تصور بالکل سیدھا سادا ہے اور وہ صرف

اتنا ہے کہ اگر انسان سے غلطی یا ظلم ہو جاتا ہے جو کہ عین تقاضائے بشریت ہے تو یہ ابد الآباد تک اس کی ذات سے چمٹ نہیں جاتا۔ انسان کے پاس تلافی کی صورت ممکن ہے جو نیکیوں / حسنات / توازن کے قیام کی شکل میں ہے۔ انسان زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے نہ صرف یہ کہ اپنے ظلم کی تلافی اسی دنیا میں کر سکتا ہے بلکہ نیکیوں میں سبقت لے جا کر صالحین میں بھی شامل ہو سکتا ہے۔ اس کے سامنے دونوں راہیں کھلی ہوئی ہیں: ظلم کی بھی اور حسنات کی بھی۔ اگر وہ ظلم کی راہ اختیار کر لیتا ہے اور ایک خاص مرحلے پر واپس آنا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اپنے گذشتہ افعال کی تلافی اعمال صالحہ کی کثرت سے کر سکتا ہے۔

احسان کے حوالے سے قرآن مجید کی تعلیمات کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ جو بھی احسان کیا جائے وہ کسی معاوضے یا صلے کی خاطر نہیں ہونا چاہیے۔ یاد رکھیئے از روئے قرآن حسنات / نیکیاں بذات خود مقصود ہیں نہ کہ مقصد کے حصول کا ذریعہ۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ﴿٦٠﴾

"کیا احسان کی جزا، احسان کے سوا کچھ اور ہو سکتی ہے؟ (سورۃ الرحمٰن: ۶۰)

باالفاظ دیگر حسن (توازن) سے حسن (توازن) پیدا ہوتا ہے۔ یعنی انسان کو چاہیے کہ وہ صرف نیکی پر نیکی کرتا چلا جائے اور کسی قسم کی جزاء کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ باالفاظ دیگر اگر آپ دوسروں کے لیے روزانہ ایک پیڑ لگاتے جائیں گے تو اللہ کا قانون آپ کو خود بخود باغ عطا کر دے گا۔ نیکی اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ اپنا آج دوسروں کے کل کے لیے قربان کر دیتے ہیں اور اللہ کا قانون آپ کو ایک بہترین کل پیش کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں مومنین کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ جب کسی کے ساتھ نیکی / احسان کرتے ہیں تو بدلے میں معاوضہ تو کجا وہ شکریے کے بھی متمنی نہیں ہوتے۔

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ﴿٩﴾

"ہم تم سے نہ معاوضہ چاہتے ہیں نہ شکریے کے متمنی ہیں۔" (سورۃ الدھر: ۹)

۴- قانون استخلاف فی الارض

اللہ تعالیٰ کے اس بین قانون کے تحت زمین میں اقتدار اور عروج و غلبہ اسی قوم کو

حاصل ہوتا ہے جو ایمان اور اعمال صالحہ کی حامل ہو اور غیر مسلم ہونے کی صورت میں کم از کم اعمال صالحہ کی حامل ہو۔

اس حوالے سے اللہ کے قانون کو دو حوالوں سے دیکھا جاسکتا ہے یعنی مسلم اور غیر مسلم کے حوالے سے۔ اس تناظر میں اس قانون کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

استخلاف فی الارض اہل ایمان کے حوالے سے

جہاں تک اہل ایمان کے حوالے سے تمکن فی الارض کا تعلق ہے اس کی اساس ایمان اور اعمال صالحہ ہیں۔ اس بنیادی کلیے کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

”تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں استخلاف فی الارض عطا کرے گا جیسا کہ تمکن ان سے پہلے کے لوگوں کو عطا کیا تھا اور یقیناً ان کے لیے اس دین کو مضبوطی کے ساتھ محکم کر کے جمادے گا جسے وہ ان کے لیے پسند کر چکا ہے اور ان کے خوف وخطر کو امن سے تبدیل کر دے گا۔ وہ میری اطاعت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اس کے بعد بھی جو لوگ ناشکری اور کفر کریں وہ یقیناً فاسق ہیں۔ (سورۃ النور:۵۵)

اس آیت کریمہ میں ایسے لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اور اعمال صالحہ انجام دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے خود وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں غلبہ اور اقتدار دے گا جیسا کہ وہ ان سے پہلے کے لوگوں کو بھی جو اس معیار کے حامل تھے، عطا کرتا آیا ہے۔ یقیناً اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اور اس کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے، اس آیت کریمہ میں اقتدار کے ساتھ جس امر کا مزید اضافہ کیا گیا ہے وہ اللہ کے

دین کا قیام بھی ہے یعنی دینِ اسلام جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شہادت دی کہ اسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے پسند کیا ہے۔ باالفاظ دیگر ایک مکمل اور جامع اسلامی مملکت کا قیام اور استحکام جو بین قرآنی اصولوں و قوانین کی عمل داری کے لیے وجود میں لائی جائے گی۔ یہ ایک ایسی ریاست ہو گی جسے اللہ تعالیٰ خود داخلی اور خارجی تحفظ عطا کرے گا، اس کے باشندوں کو حالت خوف سے حالت امن میں لے جائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی لاتعداد نعمتوں میں سے ایک بیش بہا نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو عطا کرتا ہے۔ تاہم یہاں یہ یاد رہے کہ اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کو اپنی اطاعت سے مشروط رکھا ہے یعنی یہ نعمت اس وقت تک ان مومنین / اہل ایمان کو حاصل رہے گی جب تک کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتے رہیں گے اور صرف اور صرف اللہ کے احکامات کی تابعداری کریں گے اور کسی کو بھی کسی بھی حوالے سے بلاواسطہ یا بالواسطہ اس کی اطاعت میں شریک نہیں کریں گے۔ لیکن اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو خود اس آیت کریمہ کی رو سے ایسے لوگ فاسقین میں شمار ہونے لگیں گے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم ان پر ختم ہو جائے گا۔

تمکن فی الارض، غیر مسلموں کے حوالے سے

ظاہر ہے انسانی تاریخ میں زمین پر غلبہ و اقتدار صرف اہل ایمان کو ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ غیر مسلم اقوام کو بھی بڑے پیمانے پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہوا ہے۔ جہاں تک اس قسم کی اقوام کا تعلق ہے ان کے حوالے سے کلیہ مندرجہ ذیل ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿١٠٥﴾
إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ ﴿١٠٦﴾

"ہم زبور میں ذکر کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہی ہوں گے۔ اطاعت گذاروں کے لیے اس میں بڑا پیغام ہے۔"

(سورۃ الانبیاء:١٠٦-١٠٥)

اس آیت کریمہ میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ زمین کی وراثت یا غلبہ و اقتدار کے لیے ایمان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، صرف اتنا کہا گیا ہے کہ وراثتِ ارض، اللہ کے صالح بندوں کے

لیے ہے۔ مزید بر آں ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کے اطاعت گذار بندوں کے لیے اس میں بڑا پیغام یا نصیحت ہے۔ مزید بر آں آیت (سورۃ النور:۵۵) کے بر خلاف غور کیجیے یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ صالح بندے اللہ کے دین کو قائم کریں گے یا اللہ تعالیٰ ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ اس کی وجہ سیدھی سادی ہے کہ یہاں اہل ایمان یا مومنین کا ذکر نہیں ہو رہا ہے۔ یہ زمین پر غلبے یا اقتدار یا عروج کا ایک عمومی اصول بیان کیا جا رہا ہے کہ جو قوم بھی نوعِ انسانی کو آگے لے کر چلنے کی صالح صلاحیت رکھے گی اس کو موقعہ ملے گا۔ یہ ٹھوس قانون ہے جس پر کوئی بھی عمل کر کے اس کا نتیجہ یعنی قوت و اقتدار حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ بہر حال لازمی طور پر مومن نہیں ہوں گے لہذا یہاں دین اسلام کے قیام اور اس کے ثمرات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر یہ ایک عمومی کلیہ ہے جو دنیا کی کوئی بھی قوم استعمال کر سکتی ہے اور اس کی عملی گواہی فی الوقت دنیا میں غیر مسلم قوتوں کے عروج سے بخوبی مل سکتی ہے۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ از روئے قرآن زمین پر غلبہ و اقتدار کے لیے کسی بھی صورت میں اعمال صالحہ لازم ہیں۔ ایک غیر مسلم غلبہ و اقتدار حاصل کر کے بہر حال وہ ثمرات حاصل نہیں کر سکتا جو دین اسلام کی صورت میں ممکن ہیں یعنی دین اسلام کے اعلیٰ اصولوں سے افراد و اقوام میں جو ذہنی اور قلبی تبدیلی آتی ہے، اس سے امن و سلامتی کا دور دورہ ہوتا ہے اور اس کے وہ ثمرات جو اللہ تعالیٰ کی لاتعداد نعمتوں کی شکل میں حاصل ہوتے ہیں۔

استخلاف فی الارض کا مقصد

جہاں تک زمین پر قوت و اقتدار عطا ہونے کا تعلق ہے، از روئے قرآن اس کا مقصد انصاف کی فراہمی ہے اور پست نفسانی خواہشات کی تکمیل سے احتراز۔ کیونکہ از روئے قرآن پست نفسانی خواہشات کی اطاعت سے انسان اللہ کی راہ سے بھٹک جاتا ہے اور سخت عذاب کا مستوجب ہو جاتا ہے۔ اس بین حقیقت کو سورۃ ص میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝۲۶

"اے داود! ہم نے تمہیں گذشتہ قوم کا جانشین بنایا، تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرو! وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گی۔ یقیناً جو اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا ہے۔" (سورۃ ص:۲۶)

اس آیت کریمہ کی رو سے قوت و اقتدار کا بنیادی فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو حق کا حکم دیا جائے یا ان کے درمیان حق سے فیصلے کیے جائیں باالفاظ دیگر ظلم کا خاتمہ۔ یہ ریاست یا ان لوگوں کا جنہیں اللہ تعالیٰ نے طاقت و اختیار دیا ہو ان کا سب سے پہلا فریضہ ہے۔

اس حوالے سے جس دوسرے پہلو کی جانب توجہ اس آیت کریمہ میں دلوائی گئی ہے، وہ خواہشات نفس کی پیروی سے بچنا ہے۔ طاقت کے متعلق بالعموم درست کہا جاتا ہے کہ وہ اندھی ہوتی ہے اور اگر اس طاقت پر ایمان کی گرفت نہ ہو تو وہ مکمل طور پر نفسانی خواہشات کی زیرِ نگین ہو کر زمین میں بدترین فساد پھیلا دیتی ہے جیسا کہ اس وقت کا ایک عام مشاہدہ ہے۔ وہ طاقتیں جنہیں آج کل اللہ نے طاقت و اقتدار کی نعمتوں سے نوازا ہوا ہے وہ محض اپنی باطل نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے زمین میں بری طرح فساد برپا کیئے ہوئے ہیں جو اس آیت قرآنی کی زندہ اور ناقابل تردید شہادت ہے۔

ایک مسلم اور غیر مسلم میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان یا اہل ایمان اپنی نفسانی خواہشات کو اللہ کے احکامات کے تابع رکھتا ہے اور انہیں مادر پدر آزاد نہیں چھوڑتا یا ان کا غلام نہیں بن جاتا۔ جبکہ اس کے برعکس ایک غیر مسلم چونکہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتالہذا وہ اس گرفت سے محروم ہوتا ہے۔ دوسری طرف طاقت کا نشہ اس شراب کو دوآتشہ کر دیتا ہے اور ان کی نفسانی خواہشات کا سورج آسمان پر ننگے بدن چمکنے لگتا ہے اور دنیا اس کے حسنِ جان سوز دیکھ کر بلبلا اٹھتی ہے۔

استخلاف فی الارض کا حصول

زمین پر اقتدار کیسے حاصل ہوتا ہے؟ از روئے قرآن یہ اللہ کی مدد اور صبر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٢٨﴾

"موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرو اور صبر کرو یہ زمین اللہ کی ہے وہ (اپنے قانون کے تحت) اپنے اطاعت گزاروں کو اس کا وارث بناتا ہے اور آخرت صرف اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے ہے۔"

(سورۃ الاعراف: ۱۲۸)

باالفاظ دیگر زمین پر غلبہ و اختیار اللہ کی تائید و مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ کی تائید و مدد اس کے قوانین کی کامل اطاعت سے حاصل ہو سکتی ہے دوسری طرف اس مقصد کے لیے جہد مسلسل (صبر) بھی لازم ہے۔ اللہ کے اطاعت گزار بندوں میں سے جو بھی ان معیارات کو حاصل کر لیتا ہے اللہ کا قانون اسے خلافت ارض عطا کر دیتا ہے۔ اس امر کی تائید مندرجہ ذیل آیات قرآنی سے بھی بخوبی ہوتی ہے۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٥﴾ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿٦﴾

"پھر اللہ کی مشیت سے طے شدہ قانون کے تحت اللہ نے ان پر کرم کیا جنہیں زمین میں بہت کمزور کر دیا گیا تھا اور (اسی قانون کے تحت) انہیں زمین کا وارث بنایا گیا اور تمکن عطا کیا گیا اور یہ بھی کہ ہم انہیں زمین میں قوت و اقتدار دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ دکھائیں جس سے وہ ڈر رہے ہیں۔" (سورۃ القصص: ۵۔۶)

گویا تمکن فی الارض کوئی اندھادھند عمل نہیں ہے دیگر تمام امور کی طرح یہ مظہر بھی مختلف خدائی قوانین سے مشروط ہے، جب ایک قوم اس قانون کے تحت اس معیار پر پہنچ جاتی ہے تو اللہ کا قانون انہیں خود بخود یہ نعمت عطا کر دیتا ہے۔

ہر نئی آنے والی قوم گذشتہ قوم سے بہتر ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ کے قوانین کی رو سے کوئی بھی قوم جو کسی دوسری قوم کی جگہ لیتی ہے وہ پہلے والی قوم سے بہر حال بہتر ہوتی ہے۔ اس امر کا اثبات مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے ہو سکتا ہے۔

وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ ﴿۳۸﴾

"اور اگر تم منہ موڑ لوگے تو وہ تمہاری جگہ ان لوگوں کو لے آئے گا جو تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔" (سورۃ محمد:۳۸)

آیت کریمہ کے الفاظ میں سے لفظ یستبدل پر تدبر ضروری ہے۔ اس لفظ کا مادہ ب، د، ل ہے۔ اس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی دوسری شے کی قائم مقام بن جائے یا اس کا عوض یا بدل ثابت ہو۔ تبدیلی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ شے کی صرف صورت تبدیل ہوتی ہے جبکہ اس کا جوہر بدستور رہتا ہے جبکہ ابدال کی صورت میں جوہر بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک شے کو بالکلیہ چھوڑ کر کسی دوسری شے کو اختیار کر لینا۔ تبدل کے معنی تغیر اور تبدیلی کے ہیں۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب کوئی قوم اس اساس (ایمان اور اعمال صالحہ یا صرف اعمال صالحہ) کو جس کی بنیاد پر وہ سریر آراء ارض ہوئی تھی، بدل دے تو پھر اسے خدائی قانون کے تحت اقتدار میں رہنے کا حق نہیں رہتا۔ یہ تبدیلی دو صورتوں میں ممکن ہوتی ہے: اول یہ کہ اپنے نظریۂ حیات یا دین کی ظاہری شکل و صورت وہی رہنے دی جاتی ہے لیکن اس کا جوہر تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مسلمانوں نے کیا، تمام اصطلاحات، طریقہ کار اور ظاہری شکل و صورت وہی رکھی لیکن دین کا جوہر بدل دیا۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ظاہری شکل اور جوہر سب کچھ بدل دیا جاتا ہے جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا۔ ان کے پاس ان کے دین کی نہ کوئی ظاہری شکل ہے نہ اس کا جوہر۔ بہرحال اس آیت کریمہ کی رو سے کوئی بھی قوم جب بھی اقتدار میں آئے اور آنے کے بعد اپنی اساس (اعمال صالحہ) بدل دے خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا قانون اس قوم کی جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا جو اسی قانون کے تحت ہر گز پہلی قوم جیسی نہ

ہو گی بلکہ اس سے بہتر ہو گی، کیونکہ اس کارخانۂ فطرت میں رجعت نام کی کوئی شے نہیں۔ انسانیت کا سفر صرف اور صرف آگے کی جانب ہے۔ نئی آنے والی قوم اس سفر کو مزید تیز تر کر دے گی تاوقتیکہ وہ خود بھی آمادۂ زوال نہ ہو جائے۔

اگر مسلمانوں نے جہاد سے منہ موڑا تو ان کی جگہ دوسری قوم آجائے گی

قرآن مجید میں خاص طور پر مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے اللہ کی راہ میں جہاد نہ کیا اور دنیاوی زندگی کو اخروی زندگی پر ترجیح دی تو اللہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

"اے اہل ایمان! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین سے لگ جاتے ہو۔ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر ریجھ گئے ہو؟ یاد رکھو دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں متاع قلیل ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں نہ نکلے تو تمہیں اللہ دردناک سزا دے گا اور تمہارے سوا اور لوگوں کو بدل لائے گا اور تم اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اللہ تمام اشیاء کی تقدیرات پر قادر ہے۔" (سورۃ التوبہ:۳۹-۳۸)

یہ تقدیر صرف اہل ایمان کے لیے ہے کیونکہ اللہ کی راہ میں جہاد کا حکم صرف مومنین کو دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان آیات کریمہ میں خطاب بھی صرف اہل ایمان سے کیا گیا ہے اور انہیں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اگر تم نے اللہ کی راہ میں جہاد نہیں کیا اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی تو دنیا کی زندگی کی متاع تو بہت قلیل، عارضی اور ناپائیدار ہے جبکہ اللہ کے پاس جو اجر ہے وہ لامحدود اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ لہٰذا اگر مسلمانوں نے جہاد نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا۔ جو یقیناً اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، وہ ہر ہر شے کی ہر ہر تقدیر پر بالکلیہ قدرت رکھتا ہے۔

ظلم، زوال کی بنیادی وجہ

جہاں تک قوت واقتدار یا عروج کے زوال کی وجہ کا تعلق ہے، از روئے قرآن اس کی کلیدی وجہ صرف اور صرف ظلم ہے۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۝

"اور بہت سی بستیاں ہم نے تباہ کر دیں جو ظالم تھیں اور اس کے بعد ہم نے دوسری قوم کو پیدا کر دیا۔" (سورۃ الانبیآء:۱۱)

گویا اس آیت کریمہ کی رو سے کسی بھی بستی کی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، تباہی کا قرآن مجید میں ایک ہی سبب گنوایا گیا ہے اور وہ ہے ظلم۔ لہذا ظلم کسی بھی بستی / ریاست / قوم کی تباہی کی کلیدی وجہ ہے۔ جہاں تک لفظ ظلم کا تعلق ہے اس کا مادہ ظ، ل، م ہے۔ اس کے بنیادی معنی حد سے تجاوز کرنا، نقص یا کمی کرنا، کسی شے کو اس کے مخصوص مقام سے ہٹا دینا خواہ یہ ہٹاؤ یا تبدیلی بلحاظ وقت ہو یا بلحاظ مقام، کسی کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا، حق میں کمی کرنا، واجبات کی مکمل ادائیگی نہ کرنا کے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے معنی اندھیرے اور تاریکی کے بھی ہیں یا ایسے معاملے کے جو غیر واضح ہو۔ قرآن مجید میں حدود سے تجاوز کرنے والے کو ظالم کہا گیا ہے:

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝

"جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔" (سورۃ البقرہ:۲۲۹)

اس پس منظر میں یہ امر باآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ ظلم کس طرح قوموں کے زوال کا سبب بنتا ہے۔ جو قومیں اللہ تعالیٰ کی متعین کردہ حدود کو فراموش کر دیں، دوسروں کی زیرِ ملکیت چیزوں میں ناجائز تصرفات شروع کر دیں، واجبات ادا نہ کریں اور اسی قسم کے دیگر افعال میں ملوث ہونا شروع ہو جائیں تو انہیں زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔

۵- قانون طمانیت وسکینت

اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے رو سے دلوں کو سکون واطمینان صرف اور صرف اللہ کے

قوانین کی اطاعت سے ہی ملتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؕ﴿۲۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

”جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔ یاد رکھو! دلوں کو اطمینان اللہ کے ذکر سے ہی ملتا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اعمال صالحہ انجام دیتے ہیں ان کے لیے بہترین نعمتیں ہیں اور (انتہائی) اچھا انجام۔“ (سورۃ الرعد:۲۹-۲۸)

اس آیت کریمہ کی رو سے جو بنیادی کلیہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دلوں کو اطمینان صرف اور صرف اللہ کے ذکر سے ملتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ لفظ ذکر پر تدبر کیا جائے۔ ذکر کا مادہ ذ، ک، ر ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کو محفوظ کرنے، کسی بات کو دل میں محفوظ کرنے، کسی بات کو یاد کرنے، حفاظت کرنے، ضائع نہ کرنے، شہرت، کسی کے متعلق اچھی بات کہنا، عز و شرف، عبرت و موعظت کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے بھی ہیں جس میں دین کی تفصیلات اور امتوں کے قوانین درج ہوں۔ اسی بنیاد پر قرآن مجید کو ذکر کہا گیا ہے (سورۃ النحل:۴۴)، قوانین فطرت پر غور و فکر کرنے والوں کو قوم یذکرون کہا گیا ہے (سورۃ النحل:۱۳)۔ شرف و عظمت کے معنوں میں اسے (سورۃ الزخرف:۴۴) میں لایا گیا ہے۔ خالصتاً قوانین الٰہی (یا مظاہر فطرت جو مختلف قوانین ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں) کے لیے (سورۃ الزمر:۲۱) میں آیا ہے۔

اس بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جب متذکرہ بالا آیات (سورۃ الرعد:۲۸۔۲۹) میں مکرر یہ کہا گیا ہے کہ دلوں کو اطمینان اللہ کے ذکر سے ہی ملتا ہے تو اس کا واضح طور پر مطلب یہ ہے کہ دلوں کو اطمینان قوانین خداوندی کی اطاعت بلکہ کامل اطاعت سے ہی ملتا ہے بصورتِ دیگر اس مقصد کے حصول کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

یہ ایک ایسا سیدھا سادا عام سا مظہر ہے جس کا عمومی طور پر بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام افعال کو لیجیے جنہیں قرآن مجید میں ظلم قرار دیا گیا ہے یا جنہیں کرنے سے روکا گیا ہے۔ مثلاً جھوٹ، چوری، امانت میں خیانت، دل آزاری، کینہ پروری یا اس جیسے کئی افعال۔ غور کیجیے یہ افعال انجام دہی کے بعد ان کے انجام دینے والے شخص کے لیے قلبی اضطراب کا لازمی باعث

بنتے ہیں۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ کرنے والا اس قلبی اضطراب کو تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن اس کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ افعال جن کے کرنے کی قرآن مجید میں بار بار تلقین کی گئی ہے یعنی اعمال صالحہ (جن کا بیان گذشتہ صفحات میں دیا جا چکا ہے) یہ افعال کرنے والے کے دل میں فرحت و انبساط اور سکون پیدا کرتے ہیں۔ یہی وہ سیدھی سادی بین حقیقت ہے جسے ان آیات کریمہ (سورۃ الرعد:۲۸۔۲۹) میں بیان کیا گیا ہے۔

۶- قانونِ تشکرِ نعمت

قرآن مجید کے اس قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو جو اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اپنے فضل سے مزید عطا کرتا ہے اور ایسے لوگ جو اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں انہیں سخت سزا ملتی ہے۔"

اس قانون کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَاذْكُرُونِىٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا۟ لِى وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۲﴾

"سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔" (سورۃ البقرہ:۱۵۲)

شکر، قرآن مجید کی ایک بہت جامع اصطلاح ہے۔ اس کا مادہ ش، ک، ر ہے۔ اس کے اصل معنی بھر جانا اور اظہار کرنے کے ہیں اس کے علاوہ مقدار میں کثیر ہونا بھی اس میں شامل ہے۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک انسان کی طرف سے شکر کے معنی اطاعت اور ادائے فرض، نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار اور خدا کی طرف سے شکر کے معنی پورا پورا بدلہ دینا یا تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ہے۔

چونکہ شکر کے معنی نمایاں اور ظاہر کرنا ہیں اس لیے اس کے مقابلے میں کفر کا لفظ آیا ہے۔ (سورۃ الابراہیم:۷) جس کے معنی ڈھانپ کر رکھنا اور دبا دینا ہیں۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِى لَشَدِيدٌ ﴿۷﴾

"جب تمہارے رب نے تم سے کہا اگر تم شکر کرو گے تو میں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔" (سورۃ ابراہیم:۷)

چونکہ شکر کے معنی میں اطاعت کا پہلو شامل ہے اس لیے ایک دوسرے مقام پر اس کی صراحت قرآن مجید میں کر دی گئی کہ شکر اطاعت سے مشروط ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١٧٢﴾

"اے اہل ایمان! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ اور اگر خدا ہی کی اطاعت کرتے ہو تو (اس کی نعمتوں کا) شکر بھی ادا کرو۔" (سورۃ البقرہ:۱۷۲)

اس حقیقت کا اعادہ (سورۃ النحل:۱۱۴) میں بھی کیا گیا ہے جہاں طیب کے ساتھ حلال اشیاء کا بھی اضافہ کیا گیا ہے یعنی جو حلال اور طیب اشیاء اللہ نے عطا کی ہیں انہیں کھاؤ اور اگر تم اللہ کے قوانین و احکام کے تابعدار ہو تو اس کا شکر ادا کرو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿١٧﴾

"تم اللہ کے سوا بتوں کی عبادت کرتے ہو اور جھوٹی باتیں دل سے گھڑ لیتے ہو۔ سنو! جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو وہ تمہارے رزق کے مالک نہیں پس تمہیں چاہیے کہ تم اللہ ہی سے رزق طلب کرو، اسی کی اطاعت کرو، اسی کا شکر ادا کرو اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ (سورۃ العنکبوت:۱۷)

شکر کا مفہوم

جہاں تک شکر کے قرآنی مفہوم کا تعلق ہے اس سے مراد اعمال صالحہ ہیں یعنی اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوئے ایسے افعال جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٥﴾

"اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے ہی جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے یہاں تک کہ جب خوب جوان ہوجاتا اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں ان کا شکر گذار رہوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں اصلاح (تقویٰ) دے اور میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں ہوں۔" (سورۃ الاحقاف:۱۵)

اس کی مزید وضاحت سورۃ النمل کی مندرجہ ذیل آیت میں کر دی گئی:

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ۝۱۹

"تو وہ اس کی بات پر مسکرائے اور کہنے لگے کہ اے میرے رب! مجھے توفیق عنایت کر کہ جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں میں ان کا شکر ادا کروں اور ایسے نیک اعمال کروں جنہیں تو پسند کرے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں شمار فرما۔" (سورۃ النمل:۱۹)

متذکرہ بالا دونوں آیات (سورۃ الاحقاف:۱۵) اور (سورۃ النمل:۱۹) میں شکر سے مراد اعمال صالحہ ہیں یعنی ایسے اعمال جن کی انجام دہی سے اللہ کی رضا حاصل ہو باالفاظ دیگر راہ مستقیم اختیار کرنا شکر ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۝۳

"اسے راستہ بھی دکھا دیا (اب وہ) خواہ شکر گذار ہو یا ناشکرا۔" (سورۃ الدھر:۳)

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ صحیح راہ کا انتخاب باالفاظ دیگر تقویٰ کی راہ کا انتخاب اور اس پر دل جمعی سے چلنا بھی شکر ہے۔ وہ افعال جنہیں قرآن مجید میں شکر قرار دیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اللہ کی آیات پر تدبر شکر ہے

از روئے قرآن اللہ کی آیات / نشانیوں پر غور و فکر بھی شکر میں شامل ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

"اور پاکیزہ زمین میں سے پیداوار اللہ کے حکم سے خوب ہوتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار کم نکلتی ہے۔ ہم اس طرح دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے ہیں ان لوگوں کو لیے جو شکر گذار ہیں۔" (سورۃ الاعراف:۵۸)

۲۔ صرف اللہ کی عبدیت اختیار کرنا شکر ہے

از روئے قرآن اللہ کی راہ عبدیت پر چلنا شکر ہے۔

بَلِ اللَّهَ فَاعْبُدْ وَكُن مِّنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٦٦﴾

"بلکہ اللہ ہی کی عبدیت اختیار کرو اور شکر گذاروں میں ہوں۔" (سورۃ الزمر:٦٦)

۳۔ اللہ کی عنایات کے بعد اس کی اطاعت شکر گذاری ہے

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جو عنایات کرتا ہے ان عنایت کے حصول کے بعد لازم ہے کہ اللہ کی عبدیت اختیار کی جائے یہ ان عنایات کا شکر ہے۔

قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُن مِّنَ الشَّاكِرِينَ ﴿١٤٤﴾

"ارشاد ہوا کہ موسیٰ! میں نے پیغمبری اور اپنی ہم کلامی سے (تمہیں) لوگوں سے ممتاز کیا ہے۔ تو جو کچھ میں نے تم کو عطا کیا ہے اسے پکڑ کر رکھو اور میرا شکر ادا کرو۔" (سورۃ الاعراف:۱۴۴)

بالعموم انسان اللہ کی عنایات پر اسے اپنے دست و بازو کا نتیجہ قرار دے دیتا ہے، یہ فرعونیت ہے۔ صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ اللہ کی عنایات پر اس کی عبدیت اختیار کی جائے اور اس کا شکر ادا کیا جائے۔ باالفاظ دیگر وہ تمام افعال انجام دینا جن کا اعمال صالحہ کے تحت تذکرہ کیا جا چکا ہے، شکر کہلاتا ہے۔ ٭

باب۔ 4

ابتلاء و آزمائش سے متعلق قوانین

ابتلاؤ آزمائش پوری نوع انسانی کی ایک ناقابل تنسیخ تقدیر ہے جس سے کسی کو بھی کسی حال میں کوئی مفر نہیں ہے۔ تاہم یہ امر بھی دیگر امور کی طرح کچھ قواعد و ضوابط کے تحت ہے۔ ان قوانین کو زیر نظر باب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

اس حوالے سے سب سے پہلی اور بدیہی حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی ایمان لاتے ہیں اور اعمال صالحہ انجام دیتے ہیں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کوشش کرتے ہیں ان کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا ایک لازمی اور بدیہی امر ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی یہ خصوصیت ایک قانون کی شکل میں بیان کی ہے کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں صبر سے کام لیتے ہیں، اس حقیقت کو قانون صبر کا نام دیا گیا ہے۔ اس جاں گسل جدوجہد میں مومنین کے دو بڑے سہارے دعا اور اللہ پر توکل ہوتے ہیں انہیں بالترتیب قانون دعا اور قانون استعداد و استعانت کے نام سے زیر بحث لایا گیا ہے تاکہ اس ضمن میں قوانین خداوندی سے آگاہی ممکن ہوسکے۔ ان قوانین کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

ا- قانون حق و صبر

قرآن مجید کے اس قانون کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ”ایسے تمام لوگ جنہوں

نے اللہ کی راہ کی مشکلات میں صبر سے کام لیا یا بالفاظِ دیگر اللہ کی راہ میں استقلال کا مظاہرہ کیا اس عمل کا نتیجہ لازمی طور پر کامیابی ہے یا حق پر ڈٹے رہنے والوں کو اللہ کامیابی عطا کرتا ہے۔"

اس حوالے سے لفظ صبر پر تدبر ضروری ہے۔ لفظ صبر کا مادہ ص، ب، ر ہے۔ اس کے بنیادی معنی ثابت قدمی، استقامت، جہد مسلسل، کسی موقف (بالخصوص حق) پر جم جانا، مستقل مزاجی، کسی کام کو مسلسل کیئے جانا کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کم و بیش انہی معنوں میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ صابرین کون ہوتے ہیں؟ اس کی صراحت سورۃ آل عمران میں ان الفاظ میں کر دی گئی:

فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿١٤٦﴾

"ان مصیبتوں کی وجہ سے جو انہیں اللہ کی راہ میں پہنچی سو نہ تو وہ پست ہمت ہوئے نہ دشمن کے آگے کمزوری دکھائی اور نہ بے دست و پا ہو کر بیٹھے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (سورۃ آل عمران:۱۴۶)

یہ کہا جاسکتا ہے کہ صرف یہی ایک آیت صبر اور صبر کرنے والوں کے قرآنی مفہوم کی عکاسی کے لیے بہت کافی ہے۔ گویا صبر کا قرآنی مفہوم یہ نہیں کہ انسان بے بس و بے کس و مجبور بن کر بیٹھا رہے اور ظالم کے مظالم پر مظالم سہتا چلا جائے اور منہ سے کچھ نہ بولے اس طرح مکمل بے بسی و لاچارگی کی تصویر بن جائے۔ اس کے برعکس صبر کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ مومنین پر اللہ کی راہ میں جو بھی مشکلات آتی ہیں ان پر نہ پست ہمت ہونے کی ضرورت ہے، نہ ہتھیار ڈالنے کی اور نہ دشمن کے آگے کمزور پڑ جانے کی اور نہ روایتی تصور کے تحت بے بسی اور لاچارگی کی تصویر بن جانے کی۔ بلکہ مسلسل سعی و جدوجہد، عزم، وہمت اور کاوش و سعی میں مصروف رہنا یہ صبر کا قرآنی مفہوم ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ صابرین کہلاتے ہیں اور اللہ اس قسم کا صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے جیسا کہ متذکرہ بالا آیت میں اور قرآن مجید میں دیگر متعدد مقامات پر بھی کہا گیا ہے۔ (سورۃ ابراہیم:۲۱) میں صبر کا لفظ جزعنا کے مقابل آیا ہے جزعنا کے معنی ہیں رسی کو درمیان سے کاٹ دینا۔ اس بنیاد پر صبر سے

مراد ہے کسی کام کا تسلسل۔ (سورۃ مریم:٦٥) میں اسے اللہ کی عبدیت میں استقامت اور ثابت قدمی کے لیے لایا گیا ہے۔ باالفاظ دیگر اللہ کے قوانین کی اطاعت میں بھی استقلال اور تسلسل لازمی ہے۔

ازروئے قرآن صابرین کی خصوصیات

متذکرہ بالا آیت (سورۃ آل عمران:١٤٦) میں صابرین کی تعریف دی گئی ہے تاہم قرآن مجید میں مختلف مقامات پر صابرین کی کچھ خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔ ان خصوصیات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید جب صابرین کا لفظ استعمال کرتا ہے تو وہ ان لوگوں کو کن خصوصیات سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

١) اللہ کی جانب سے آزمائش خواہ وہ دشمنوں کے خوف، بھوک پیاس، مال و جان کے خسارہ کی شکل میں ہو، اس میں استقلال سے کام لینے والے۔ (سورۃ البقرہ:١٥٥)
٢) مصائب میں ثابت قدم (سورۃ البقرہ:١٥٦)
٣) ایمان رکھنے والے، اللہ کی راہ میں مال کا انفاق کرنے والے اور نامساعد حالات میں ثابت قدم رہنے والے۔ (سورۃ البقرہ:١٧٧)
٤) نفس پر قابو رکھنے والے (سورۃ الحجرات:٥)، (سورۃ الکہف:٢٧) اور (سورۃ البقرہ:٢٤٩)
٥) جنسی معاملات میں نفس پر قابو رکھنے والے (سورۃ النساء:٢٥)
٦) مخالفین کی جانب سے تکذیب پر صبر کرنے والے (سورہ الانعام:٣٤)
٧) نتائج کا پورے حوصلے اور استقلال کے ساتھ انتظار کرنے والے (سورۃ الاعراف:٨٧)
٨) میدان جنگ میں قطعی طور پر ثابت قدم، اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے، اللہ اور اس کے رسول کے مطیع (سورۃ الانفال:٤٥-٤٦)
٩) اللہ کی رضا کے طالب (سورۃ الرعد:٢٢)
١٠) کسی بھی حادثے میں ثابت قدم رہنے والے (سورۃ الحج:٣٥)

یہ اور اس کے علاوہ بھی متعدد خصوصیات ازروئے قرآن صابرین میں پائی جاتی ہیں۔ صابرین میں مومن مرد اور مومن عورتیں دونوں شامل ہوتی ہیں۔ (سورۃ الاحزاب:٣٥)

صبر کے نتائج

وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں صبر کرتے ہیں ان کو دنیا اور آخرت دونوں جگہوں کی فلاح اور اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

أُولَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوَٰتٞ مِّن رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٞۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ ﴿١٥٧﴾

"ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔" (سورۃ البقرہ:۱۵۷)

واضح رہے کہ اس آیت کریمہ (سورۃ البقرہ:۱۵۷) سے متصل پچھلی دو آیات میں مسلسل صابرین کا بیان ہے اور اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ صابرین کے لیے اللہ کی بے پناہ نوازشات ہیں اور اس کی بے پاں رحمت کے حقدار یہی لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صابرین کو ہی صادقین اور متقین کہا ہے۔ (سورۃ البقرہ:۱۷۷)

از روئے قرآن اگر مسلمان صبر اور تقویٰ سے کام لیں تو اسلام دشمنوں کا مکر انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا:

إِن تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٞ تَسُؤۡهُمۡ وَإِن تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٞ يَفۡرَحُواْ بِهَاۖ وَإِن تَصۡبِرُواْ وَتَتَّقُواْ لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـًٔاۗ إِنَّ ٱللَّهَ بِمَا يَعۡمَلُونَ مُحِيطٞ ﴿١٢٠﴾

"اگر تمہیں بھلائی ملے تو یہ ناخوش ہو جاتے ہیں ہاں اگر برائی پہنچے تو خوش ہو جاتے ہیں۔ تم اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کا مکر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کا احاطہ کر رکھا ہے۔" (سورۃ آل عمران:۱۲۰)

صبر اور جہاد کا منطقی نتیجہ فلاح ہے

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱصۡبِرُواْ وَصَابِرُواْ وَرَابِطُواْ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

"اے اہل ایمان! تم ثابت قدم رہو اور ایک دوسرے کی مدد کرو اپنی حفاظت کا مستحکم انتظام کرو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔"

(سورۃ آل عمران:۲۰۰)

یہاں فلاح سے مراد کھیتیوں کا پروان چڑھ جانا ہے یا محنت کا بار آور ہونا یا کامیابی اور بقا کا نصیب ہونا۔ ایسی بقا جو دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر محیط ہو۔ صابرین کا یہ اجر دنیا اور آخرت دونوں جگہوں پر محیط ہوتا ہے۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤٧﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٤٨﴾

"وہ یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم سے ہمارے کاموں میں جو بے جا زیادتی ہوئی ہے اسے معاف فرما اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور ہمیں کافروں کی قوم پر فتح عطا کر۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کی آسائشات اور نعمتیں عطا کیں اور آخرت کی بھی اور اللہ محسنین کو پسند کرتا ہے۔" (سورۃ ال عمران:۱۴۸-۱۴۷)

نہ صرف متذکرہ بالا آیات بلکہ اس حوالے سے قرآن مجید کی مزید آیات کے حوالے بھی دیئے جاسکتے ہیں جہاں صابرین کے بہترین انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً:

۱) انہیں تمکن فی الارض عطا ہوتا ہے۔(سورۃ الاعراف:۱۲۷۔۱۲۸)
۲) اپنے سے دس گنا بڑے دشمن پر کامیابی عطا ہوتی ہے۔(سورۃ الانفال:۶۵)
۳) کمزوری کی صورت میں کم سے کم دوگنے پر کامیابی عطا ہوتی ہے۔(سورۃ الانفال:۶۶)
۴) ان کا انجام بہت اچھا ہوتا ہے۔(سورۃ الرعد:۲۲)
۵) یہ جنت کے حقدار ہوتے ہیں۔(سورۃ الدھر:۱۲)،(سورۃ الفرقان:۷۵)،(سورۃ الدھر:۲۴)
۶) ان کے لیے دہرا اجر ہے۔(سورۃ القصص:۵۴)
۷) ان کا اجر بغیر کسی حساب کے ہے۔(سورۃ الزمر:۱۰)
۸) یہ خوف و حزن سے محفوظ رہتے ہیں۔ (سورۃ الاحقاف:۱۳۔۱۴)
۹) ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ (سورۃ حم السجدہ:۳۰)
۱۰) ان کا اجر ضائع نہیں کیا جاتا۔(سورۃ یوسف:۹۰)

یاد رکھیئے از روئے قرآن

۱) اللہ تعالیٰ کی نصرت، تائید اور مدد صبر اور الصلوۃ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔(سورۃ البقرہ: ۴۵اور ۱۵۳)

۲) اگر مسلمان اللہ کے دین کے لیے جدوجہد کریں گے تو اللہ ان کی مدد کرے گا اور انہیں استقامت عطا کرے گا۔(سورۃ محمد:۷)

۲- قانون دعا

جہاں تک دعا کا تعلق ہے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ "کسی بھی نوعیت کی کسی بھی مشکل کے حل کے لیے خواہ اس کی نوعیت ہنگامی ہو یا عمومی، اعمال صالحہ پر استقلال سے قائم رہنے کے لیے، کسی مثبت مقصد کے حصول یا تکمیل خواہش کے لیے انسانوں کی جانب سے اللہ تعالیٰ سے مدد کی التجا، دعا کہلاتی ہے۔

اس حوالے سے اگر قرآن مجید فرقان حمید کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُم الکتاب میں مذکور تمام دعائیں، دعا کی مندرجہ بالا تعریف کے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق ہیں۔ بنیادی طور پر یہ چار پہلو ہیں یعنی:

۱) کسی بھی نوعیت کی کسی بھی مشکل کے حل کے لیے

۲) اعمال صالحہ پر استقلال سے قائم رہنے کے لیے اور خطاؤں سے درگذر کے لیے

۳) کسی مثبت مقصد کے حصول کے لیے اور

۴) کسی مثبت خواہش کی تکمیل کے لیے

تاہم اس سے پہلے کہ دعا کے ان چاروں پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے یہ ضروری ہے کہ پہلے دعا کی نوعیت وماہیت کو سمجھا جائے۔

دعا کی نوعیت وماہیت

جیسا کہ دعا کی تعریف کے حوالے سے کہا گیا کہ یہ بنیادی طور پر انسانوں کی جانب سے رب العالمین کے حضور ایک التجا یا درخواست ہے جس میں انسان اللہ تعالیٰ سے کچھ خصوصی

تقدیرات / قوانین کو بروئے کار لانے کی استدعا کرتا ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ یہ خصوصی تقدیرات یا قوانین، کہیں سے اچانک سامنے نہیں آتے یہ مشیت ایزدی کی جانب سے پہلے سے متعین شدہ ہیں جس طرح دیگر قوانین عمل میں آتے ہیں اسی طرح یہ قوانین بھی عمل میں آتے ہیں تاہم اس فرق کے ساتھ ان کی نوعیت کسی حد تک خصوصی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر عام روزمرہ زندگی میں جو معمول کے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ عام قوانین کے تحت ہوتے ہیں لیکن اسی عام زندگی میں بعض اوقات ایسے اچانک یا غیر متوقع واقعات مشکلات کی شکل میں سامنے آجاتے ہیں جن کا بظاہر کوئی حل سمجھائی نہیں دیتا یا واقعات اتنے یک لخت اور اچانک وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ یا ایک ایسی صورتحال جس کے تحت انسان ایک بلند تر مقصد یا مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہا ہو اور وہ اپنے عزم و حوصلے کی استقامت کا خواہش مند ہو یا کسی ایسی خواہش کی تکمیل مقصود ہو جس میں کسی کا کوئی نقصان نہ ہو بلکہ عوام الناس کے فائدے کا ہی امکان ہو لیکن اس کی تکمیل بظاہر ممکن دکھائی نہ دے رہی ہو یا اس سے ملتے جلتے حالات اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد و اعانت کے متقاضی ہوتے ہیں ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی مدد کے لیے جو خصوصی قوانین متعین کیئے ہیں انسانوں کی جانب سے انہی قوانین کے تحت اللہ تعالیٰ سے خصوصی مدد و اعانت کی التجا، دعا کہلاتی ہے۔

دعا کے ذریعے مشکلات کا حل، اللہ تعالیٰ کی مشیت سے طے شدہ قوانین کے ذریعے ہی ہوتا ہے

دعا سے کوئی معجزہ برپا نہیں ہوتا بلکہ دعا کے ذریعے مختلف النوع انسانی مشکلات کا حل انہی قوانین کے توسط سے ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں طے کر دیئے ہیں۔ اس استدلال کی مزید تصدیق مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے بھی ہوتی ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝

"اگر تم سچے ہو تو یہ بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا (بری) گھڑی تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ (نہیں) بلکہ تم اللہ ہی کو پکارتے ہو پھر وہ اپنی مشیت سے اس مصیبت کو دور کر دیتا ہے اور تم انہیں بھول جاتے ہو جنہیں تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔" (سورۃ الانعام:۴۱-۴۰)

اس آیت کریمہ میں جہاں ایک طرف اس عمومی انسانی طرز عمل کا بیان ہے جس کے تحت انسان جب بھی کبھی کسی مشکل سے دوچار ہوتا ہے تو اس مشکل گھڑی میں اسے صرف اور صرف اللہ کی ذات یاد آتی ہے اور تمام شریک جو وہ اللہ کی ذات و صفات میں بناتا ہے انہیں لمحے بھر میں بھول جاتا ہے اور خالصتاً دل کی گہرائیوں سے صرف اور صرف اللہ کو یاد کرتا ہے تاہم جونہی اللہ تعالیٰ اپنے قانون مشیت سے اس کی مشکل حل کر دیتا ہے تو اگلے لمحے وہ پھر شرک کرنے لگ جاتا ہے۔

تاہم اس انسانی فطرت سے قطع نظر موضوع زیر بحث کے حوالے سے جو اہم نکتہ اس آیت سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو جب مشکلات سے نجات دیتا ہے تو اپنی مشیت سے طے شدہ قوانین کے تحت ہی دیتا ہے۔ اس امر کا اثبات متذکرہ بالا آیت کریمہ کے لفظ ان شآء سے بخوبی ہوتا ہے جس کا مطلب ہے "اپنی مشیت سے" یہاں لامحالہ اللہ کی مشیت سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے کیئے جانے والے کوئی من مانے فیصلے نہیں ہیں۔ وہ یقیناً ہر امر پر مکمل قدرت رکھتا ہے لیکن وہ تمام تر قدرت رکھنے کے باوجود وہ خود ایسا نہیں کرتا کیونکہ ایسا نہ کرنا اس نے اوپر فرض کر لیا ہے۔ بدیہی طور پر یہاں ان شآء سے مراد اللہ کی مشیت سے طے شدہ وہ تقدیریں یا قوانین ہیں جو اس قسم کی خصوصی صورتحال میں بروئے کار آتے ہیں۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی رحیمیت اور رحمانیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے کیونکہ ان دونوں کا دعا سے بہت گہرا تعلق ہے۔ لفظ رحمت اور رحمان دونوں کا مادہ ر، ح، م ہے۔ اس کے معنی نرم دل ہونا، مہربان ہونا، شفقت کرنا، بخش دینا، معاف کرنا، قرابت داری، رشتے داری، محبت و مروت کے ساتھ ساتھ عورت کے بطن کے اس خانے کے بھی ہیں جس میں بچہ پرورش پاتا ہے اور اس غلاف میں بیرونی اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ رحمۃ سے مراد اس عطیے کی لی جاتی ہے جسے کسی کی ضرورت کے مطابق دیا جائے اور جو کسی کی ظاہر و باطن

میں کمی کو دور کر دے۔ اسی حوالے سے رحمت سے مراد وہ تمام تر سامان نشو و نما ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوع انسانی کو عطا کیا جاتا ہے اور جو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطیے کی صورت میں ہوتا ہے بالفاظ دیگر بغیر کسی معاوضے یا قیمت یا عوض کے عطا کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کو زندگی کی منجملہ تمام نعمتوں کے لیے (سورۃ الروم:۳۶) میں لایا گیا ہے۔ انسانی زندگی کی نشو و نما اور اس کی پرورش کے لیے درکار تمام تر چیزوں کے لیے (سورۃ الروم:۳۷) میں آیا ہے۔ تمام تر سامان رزق کو رحمت کہا گیا ہے (سورۃ الروم:۴۶)، (سورۃ الشوریٰ:۲۸)۔ زندگی کی تمام تر خوشگواریاں جو بلا کسی معاوضے کے ملیں، اسی میں شامل ہیں۔ (سورۃ ھود:۹۔۱۰) میں نعمتوں / سہولتوں / دنیاوی آسائشوں کو میں بھی رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (سورۃ الکھف:۸۲) اس سے مراد تحفظ فراہم کرنا، سامان حفاظت کی فراہمی اور ضرر سے محفوظ رکھنا بھی ہے۔ (سورۃ یونس:۲۱) اور (سورۃ الروم:۳۳) میں ہلاکت کے مقابلے میں تحفظ کے لیے آیا ہے۔ (سورۃ الملک:۲۸) میں برائیوں سے بچاؤ کے لیے آیا ہے۔ (سورۃ الروم:۳۶) گویا زندگی کی تمام تر نعمتیں خواہ ان کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو اور منجملہ تمام اقسام کی برائیوں، مشکلات، ضرر اور تکالیف سے تحفظ اس میں شامل ہے۔ رحمت ایک مسلسل اور عمومی عمل ہے جبکہ رحمان سے مراد وہ ہستی ہے جو کسی بھی اچانک، غیر متوقع اور ہنگامی صورتحال میں سامان رحمت فراہم کرے۔ بالفاظ دیگر رحمت ایک عام ارتقائی عمل کے تحت ہے جبکہ ثانی الذکر اس ارتقائی عمل میں کسی چھلانگ یا فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کے حوالے سے کسی بھی قسم کی امداد، مدد یا کسی بھی قسم کی اعانت ہے۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دعا بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی ان تمام تقدیرات / قوانین سے متعلق ہے جو رحم کے زمرے میں آتی ہوں اور رحم کا تصور خود از روئے قرآن اس قدر وسیع ہے کہ اس میں زندگی سے متعلق منجملہ تمام امور آ جاتے ہیں۔

دعا کی شرائط

جہاں تک دعا کا تعلق ہے یہ امر ذہن میں رکھا جانا ضروری ہے کہ دعا کے دروازے تمام نوع انسانی کے لیے ہر وقت، ہر جگہ بلا کسی استثنیٰ کے کھلے ہیں۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

"جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ (ﷺ) کہہ دیجیئے کہ میں ان کے بہت ہی قریب ہوں اور ہر پکارنے والے کی پکار کا جب وہ مجھے پکارتا ہے تو میں اس کا جواب دیتا ہوں تو انہیں چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ راہ ہدایت پاسکیں۔" (سورۃ البقرہ:۱۸۶)

نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے بلکہ نوع انسانی کو اس حوالے سے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پکاریں اللہ تعالیٰ ان کی پکار کا جواب دیتا ہے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾

"اور تمہارے رب نے کہا کہ مجھے پکارو میں اس کا جواب دوں گا۔ وہ لوگ جو میری اطاعت سے تکبر میں انکار کرتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔" (سورۃ المؤمن:۶۰)

اگر ان دونوں آیات کریمہ پر بیک وقت تدبر کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ دونوں مقامات پر دعا کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ بھی اللہ سے دعا مانگیں ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ احکامات خداوندی کی اطاعت کریں۔ مقام تدبر یہ ہے کہ اول الذکر آیت میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں پھر یہ کہا گیا کہ ہر پکارنے والا میری اطاعت کرے اور مجھ پر ایمان لائے۔ یہاں انتہائی توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ پہلے یہ کہا گیا کہ میرا حکم مانیں اور پھر ایمان کا مطالبہ کیا گیا ہے جبکہ اگر پورے قرآن مجید کا جائزہ لیا جائے تو تقریباً تمام مقامات پر ایمان کا مطالبہ پہلا ہوتا ہے اور اعمال صالحہ کا بعد میں۔ ظاہر ہے اگر یہاں یہ ترتیب تبدیل کی گئی ہے تو اس کی کوئی وجہ بھی ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں خطاب پوری نوع انسانی سے ہے اور پوری نوع انسانی ظاہر ہے صرف اہل ایمان پر مشتمل نہیں ہے اس میں اہل ایمان اور غیر مسلم

دونوں شامل ہیں۔ اور دوسری طرف دعا کی بابت جو کلیہ / قانون بیان کیا گیا ہے وہ پوری نوع انسانی کے لیے ہے۔ وہ کلیہ کیا ہے؟ وہ سادہ طور پر یہ ہے کہ دعا کی قبولیابی کے لیے لازمی شرط احکام خداوندی کی اطاعت ہے۔ اب اگر ایک انسان خواہ وہ کوئی ہو مسلم یا غیر مسلم جب تک وہ احکام خداوندی کی اطاعت نہیں کرے گا تو دعا اس کی یقیناً سنی جائے گی لیکن قبولیابی کا امکان بہر حال نہیں ہو گا کیونکہ اس حوالے سے بنیادی شرط ہی یہ عائد کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی جو دعا کے لئے سب سے پہلی اور سب سے بنیادی شرط ہے۔

اس مر کی مزید تصدیق متذکرہ بالا آیت (سورۃ المومن:٦٠) سے بھی ہوتی ہے جہاں مکرر نوع انسانی کو کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پکاریں اللہ تعالیٰ ان کی پکار کا جواب دیتا ہے لیکن ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ جو لوگ بھی میری اطاعت سے انکار کریں گے وہ ذلیل و خوار ہو کر واصل جہنم ہوں گے۔ گویا یہاں بھی دعا کو اللہ کی اطاعت سے مشروط کیا گیا ہے۔ گویا جو شخص بھی اللہ کے قوانین کی اطاعت نہیں کرتا اس کا انجام تو ویسے بھی ذلت وخواری اور جہنم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی دعاؤں کی قبولیابی کا امکان بھی صفر ہو جاتا ہے۔

اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان دونوں آیات میں اللہ کی مدد و اعانت کو انسانوں کی جانب سے پکار سے مشروط کیا گیا ہے۔ انسان اس حوالے سے حاجت مند ہوتا ہے لہذا التجا اس کی جانب سے آنی چاہیے اگر وہ اپنے غرور و تکبر میں سرے سے اللہ کو بھلا دے تو ظاہر ہے اس میں نقصان خود اس کا اپنا ہے اللہ کی ذات تو مکمل طور پر کسی بھی قسم کی حاجت و ضرورت کے تصور سے ہی منزہ ہے۔ لہذا دعا کے لیے یہ ضروری ہے کہ ابتدا انسان کی جانب سے ہو۔

یہاں اس حوالے سے ایک نکتہ اور بھی مستنبط ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف اس دعا کی قبولیابی کا امکان ہوتا ہے جو قوانین فطرت کے عین مطابق ہو کوئی بھی ایسی دعا قبول نہیں ہو سکتی اور نہ اس کا کوئی امکان ہوتا ہے جو مختلف قوانین یا کسی بھی قانون سے متصادم ہو۔ مثال کے طور پر ایک قوم اگر مسلسل ظلم کرتی چلی جائے اور پھر یہ دعا کرے کہ اسے استخلاف فی الارض حاصل ہو جائے تو ظاہر ہے یہ کارِ لاحاصل ہے۔ جیسا کہ فی الوقت اُمت مسلمہ کر رہی ہے۔ استخلاف فی الارض کی بنیادی شرط ایمان اور اعمال صالحہ ہیں (سورۃ

النور:۵۵)۔ لیکن اگر قوم کا نہ ایمان سے کوئی تعلق ہو نہ اعمال صالحہ سے تو ظاہر ہے استخلاف فی الارض کی دعائیں صبح شام مانگتے رہیں ان سے کچھ نہیں ہو گا کیونکہ یہ دعا بنیادی قانون فطرت سے انحراف کر کے مانگی جارہی ہے۔

اسی طرح اگر ایک شخص ظلم کر کے برأت کی دعا مانگے تو ظاہر ہے اس کا بھی کوئی جواز نہیں ہو گا یا ایک طالب علم بغیر محنت کیئے اچھے نمبر لانے کی دعا کر تا رہے تو وہ بھی ہوا میں تیر چلانے کے مصداق ہو گا۔ باالفاظ دیگر دعا کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ مختلف النوع قوانین فطرت سے متصادم نہیں ہونی چاہیے۔

دعا زندگی کی کسی بھی قسم کی مشکل / پریشانی یا تکلیف پر محیط ہے

از روئے قرآن انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں ہے یا کوئی بھی مشکل یا پریشانی یا تکلیف ایسی نہیں ہے جس پر دعا محیط نہ ہو۔ یہ مشکلات، پریشانیاں یا تکالیف خواہ معمولی یا عام نوعیت کی ہوں یا کتنی ہی شدید کیوں نہ ہوں، ان کی نوعیت کسی بھی قسم کی ہو ان تمام کے حل کی کلید دعا ہے بشر طیکہ اس کے تمام تقاضوں کی مناسب تکمیل کی گئی ہو۔ اس امر کا اثبات اس حقیقت سے بھی ہو تا ہے کہ قرآن مجید میں دعا سے متعلق جو مختلف آیات ہیں ان میں زندگی کی منجملہ تمام تر مشکلات، پریشانیوں اور تکالیف کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو دعا کے طفیل دور کر دیتا ہے تاہم مکرر ذہن میں رکھیئے کہ ایسا اسی وقت ہو تا ہے جب دعا کے تقاضوں کی تکمیل کر دی گئی ہو۔ اس حوالے سے سورۃ لقمان کی مندرجہ ذیل آیات پر تدبر ضروری ہے جہاں ارشاد ربانی ہے:

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

"اور جب ان پر موجیں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو وہ (نہایت) خلوص کے ساتھ اللہ ہی کو پکارتے ہیں پھر جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچاتا ہے تو کچھ ان میں سے اعتدال پر رہتے ہیں اور ہماری آیات کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو بد عہد اور ناشکرے ہوں۔" (سورۃ لقمان:۳۲)

اس آیت کے ابتدائی الفاظ پر غور کیجیے جہاں کہا گیا کہ "جب ان پر اضطراب مکمل طور پر چھا جاتا ہے۔" یہاں آیت میں آنے والے لفظ موج پر تدبر ضروری ہے جس کے معنی اضطراب کے ہیں یعنی کسی بھی نوعیت کا کسی بھی قسم کا اضطراب جو کسی بھی مشکل کا نتیجہ ہو۔ اس کے لیے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی دعاؤں (جبکہ وہ اپنے مکمل تقاضوں کے ساتھ مانگی گئی ہوں) کو قبول کرنے کی صورت میں انسانوں کو اس قسم کے کسی بھی اضطراب سے انہیں تحفظ دے دیتا ہے۔ یہاں اس مقصد کے لیے آیت کریمہ میں لفظ نجاھم آیا ہے۔ اس لفظ کا مادہ ن، ج، و ہے۔ اس کے معنی کسی ایسی چیز سے محفوظ رہنے کے ہیں جس سے خطرہ ہو، اس کے علاوہ بلند جگہ، تیز چلنے، آگے نکل جانے، کسی چیز سے الگ ہو جانے، چھیل دینے، کھول دینے یا متضاد معنوں میں چھپانے اور پوشیدہ کرنے کے بھی ہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اضطراب سے محفوظ کر دیتا ہے یا جس چیز سے خطرہ ہو اس سے الگ کر دیتا ہے یا ممکنہ خطرات سے چھپا لیتا ہے۔

اس حوالے سے سورۃ الانعام کی مندرجہ ذیل آیات پر بھی تدبر لازمی ہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾

"ان سے پوچھیں کون انہیں صحرا اور سمندر کی تاریکیوں سے بچاتا ہے جب تم گڑ گڑا کر اور چپکے چپکے اسے پکارتے ہو کہ اگر وہ تم کو بچا لے تو ہم ضرور شکر گذار ہوں گے۔ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے اور ہر تکلیف سے بھی (بچاتا ہے) پھر بھی تم شرک کرتے ہو۔" (سورۃ الانعام: ٦٤-٦٣)

یہاں آیت (سورۃ الانعام: ٦٤) میں تکلیف کے لیے کرب کا لفظ آیا ہے۔ اس لفظ کا مادہ ک، ر، ب ہے۔ اس کے معنی شدید غم کے ہیں۔ اس کے بنیادی معنی شدت اور قوت کے ہیں یعنی ایک ایسی کیفیت جب انسان غم و اندوہ میں بری طرح جکڑا جائے۔ گویا ایک ایسی صورتحال جب انسان بری طرح غم و اندوہ میں گھرا ہو اور اسے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی ہو۔ اس صورت میں دعا ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان اس کیفیت سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی واضح رہے کہ آیت کریمہ میں صرف لفظ کرب

نہیں آیا ہے بلکہ کل کرب کے الفاظ آئے ہیں یعنی اس دنیا میں غم واندوہ، مایوسی، افسردگی کی جتنی بھی اشکال ہیں یہ علاج یعنی دعا ان سب کے لیے اکسیر ہے۔ لیکن شرط بہرحال وہی ہے یعنی اپنے مکمل تقاضوں کے ساتھ ورنہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سورۃ النمل میں دعا کو منجملہ تمام اقسام کے عدم توازن، ناگوار صورتحال، برائی، بری بات سے نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ارشاد ربانی ہے:

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا ۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

"بھلا وہ کون ہے؟ جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس کی تکلیف دور کرتا ہے اور تمہیں زمین میں (گذشتہ نوع کا) جانشین بناتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ تم بہت کم نصیحت اور عبرت حاصل کرتے ہو۔

(سورۃ النمل:۶۲-۶۲)

اس آیت کریمہ میں تکلیف کے لیے لفظ سوٓء آیا ہے۔ اس کا مادہ س، و، أ ہے۔ اس کے معنی کسی ناگوار بات کے ہیں یا کوئی بری شے، ناہمواری، عدم توازن یا ناخوشگواری وغیرہ، یہ حسنۃ (توازن) کی ضد ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معنی افراط و تفریط، عیوب و نقائص، مغموم یا متردد ہونے کے بھی ہیں۔ بالالفاظ دیگر کسی بھی قسم کی ناہمواری، عدم توازن، افراط و تفریط یا کسی بھی نوعیت کی کوئی بھی برائی سے دوچار کوئی بھی شخص، کبھی بھی اور جہاں بھی اللہ سے دعا کرے گا اللہ اس کی دعا سنتا ہے اور اگر اس شخص نے دعا کے تقاضے پورے کیئے ہوں تو لامحالہ اللہ تعالیٰ اس کی تمام ناہمواریاں، عیوب و نقائص دور کر دیتا ہے۔

گویا انسان کی زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا پہلو، مصیبت، مشکل، پریشانی، غم، عدم توازن یا اس قسم کی کوئی بھی منفی صورتحال ایسی نہیں ہے جس کا حل دعا میں پوشیدہ نہ ہو۔

دعا صرف اور صرف اللہ کی ذات سے ہی مانگی جاسکتی ہے

قرآن مجید کا واضح اور صریح حکم ہے کہ دعا صرف اور صرف اللہ کی ذات سے ہی مانگی

جا سکتی ہے اس کے علاوہ کوئی الہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ واحد ہستی ہے جو اس کائنات کی منجملہ تمام اشیاء کی تمام تقدیرات پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی بھی ہستی اس قسم کی کوئی استطاعت نہیں رکھتی۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

"بے شک اللہ تمام اشیاء کی (منجملہ تمام) تقدیرات پر قادر ہے۔"

(سورۃ البقرہ:۲۰)

جب تمام تر قاعدے / قوانین / تقدیرات اللہ کی مشیت سے ترتیب پاتے ہیں۔ کائنات کی تمام اشیاء صرف اور صرف اللہ ہی کو سجدہ کرتی ہیں اس کائنات کی کوئی شے اس کے قبضے واختیار سے باہر نہیں ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

"زمین اور آسمان اللہ ہی کے مِلک میں ہیں۔" (سورۃ النساء:۱۳۲)

ایسی صورتحال میں دعا ظاہر ہے صرف اور صرف اللہ ہی سے کی جاسکتی ہے اس لیے صرف اللہ تعالیٰ سے ہی دعا ممکن ہے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ

"اور تمہارے رب نے کہا مجھے پکارو میں ان کا جواب دوں گا۔"

(سورۃ المؤمن:۶۰)

اللہ کے سوا کسی بھی ہستی سے مانگی جانے والی دعا محض کارلاحاصل ہے

از روئے قرآن اللہ کے علاوہ کسی بھی ہستی سے جو بھی دعا مانگی جائے گی وہ بے کار محض ہے اور اس کا کبھی بھی، کسی بھی صورت میں کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ

"اسی کو پکارنا حق ہے۔ جو لوگ اوروں کو اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان (کی پکار) کا

کچھ بھی جواب نہیں دیتے مگر جیسے کہ کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو کہ اس کے منہ میں پڑجائے حالانکہ پانی کبھی اس کے منہ میں پہنچنے والا نہیں۔ ان منکرین کی جو بھی پکار ہے وہ سب گمراہی ہے۔" (سورۃ الرعد:۱۴)

ظاہر ہے کسی بھی قانون فطرت کے تحت ایک پیاسا لاکھ یہ توقع کرے کہ پانی خود اس کے منہ تک آجائے تو اس کی یہ توقع کبھی بھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کسی بھی ہستی سے خواہ وہ انسانوں میں سے ہو یا بے جان اشیاء میں سے کسی کے پاس یہ طاقت تو کجا طاقت کا شائبہ بھی نہیں کہ وہ کسی انسان کی دادرسی کر سکے۔ اس کی وضاحت اس آیت کریمہ (سورۃ الرعد:۱۴) میں دی جانے والی مثال سے بخوبی ہو سکتی ہے یعنی ماسوا اللہ کسی بھی ہستی سے مانگنا قوانین فطرت کے بالکل برخلاف ہے جس طرح پانی کبھی خود پیاسے کے منہ تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح غیر از خدا کسی بھی ہستی کے بس میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی بھی دوسرے شخص کی دعا کو پورا کر سکے۔ کیونکہ از روئے قرآن اس قسم کی تمام ہستیاں کسی بھی انسان کو نہ نفع نہ نقصان کچھ بھی نہیں پہنچا سکتیں (سورۃ الانعام:۷۱)، (سورۃ الیونس:۱۰۶)، (سورۃ بنی اسرائیل:۵۶)، (سورۃ الحج:۱۲۔۱۳) اور (سورۃ الشعراء:۷۳۔۷۴) وغیرہ۔ ایسی ہستیاں کسی کی بھی، کسی قسم کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں (سورۃ الاعراف:۱۹۷) مدد کرنا تو درکنار وہ تو پکارنے والوں کی بات تک نہیں سن سکتیں، انہیں کسی قسم کی کوئی قوت یا اختیار حاصل نہیں ہے (سورۃ السباء:۳۲) اور (سورۃ الفاطر:۱۳)۔ وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے (سورۃ الفاطر:۴۰) حتیٰ کہ ایک مکھی بھی نہیں (سورۃ الحج:۷۳)، بنیادی طور پر وہ خود مخلوق ہیں (سورۃ النمل:۲۰)۔ یہ سب روز قیامت غائب ہو جائیں گے (سورۃ المؤمن:۷۴) اور (سورۃ حم السجدہ:۴۸)۔ اس فعل کے حق میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی، یہ محض ظن کی پیروی ہے (سورۃ الیونس:۶۶)۔ اور حتمی برھان یہ ہے کہ اللہ کے سوا جس کو بھی پکارا جائے گا وہ صرف اور صرف باطل ہو گا۔ (سورۃ الحج:۶۲) اور (سورۃ لقمان:۳۰) اور اگر اللہ کے سوا کسی کو بھی پکارا جائے تو یہ عذاب خداوندی کو دعوت دینے والی بات ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۝۲۱۳

"پس تم اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہ پکارو ورنہ تم پر بھی عذاب آجائے گا۔" (سورۃ الشعرآء:۲۱۳)

۳- قانون استمداد و استعانت

قانون استمداد و استعانت سے مراد اہل ایمان کی جانب سے اس امر کا مکمل یقین ہے کہ صرف اور صرف اللہ پر توکل کیا جانا چاہیے۔

جہاں تک لفظ توکل کا تعلق ہے اس کا مادہ و ک، ل، ہے۔ اس کے معنی کسی پر اعتماد کرنے، معاملات کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے، کسی معاملے کی ذمے داری لینے وغیرہ کے ہیں۔ اس بنیاد پر وکیل اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی دوسرے کے معاملات و امور کی نگرانی اور دیکھ بھال کرے۔

اس قانون کے تحت انسانوں کی جانب سے اللہ پر توکل سے مراد اللہ کے ان قوانین یا تقدیرات پر اندھا اعتماد ہے جو کبھی کسی صورت، کسی بھی حوالے سے تبدیل نہیں ہوتے۔ ایک مومن کو اللہ کے قوانین کی حقانیت پر مکمل ایمان ہوتا ہے اسی وجہ سے مومنین کو قرآن مجید میں متوکلین (سورۃ آل عمران:۱۵۹) بھی کہا گیا ہے اور صرف اور صرف اللہ پر توکل کرنے کو کہا گیا ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾

"اور مختلف امور میں ان سے مشاورت کرتے رہو اللہ پر توکل رکھو، بیشک اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (سورۃ آل عمران:۱۵۹)

آیت کریمہ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ توکل کا مطلب یہ ہر گز ہر گز نہیں کہ خود کچھ نہ کیا جائے اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر اس امر کا انتظار کیا جائے کہ معاملات کو اللہ خود ہی سنوارتا چلا جائے گا یا مسائل اللہ تعالیٰ خود ہی حل کر دے گا۔ یہ توکل کی انتہائی غلط تشریح ہے۔ جبکہ جیسا کہ ان آیات کریمہ سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم باہم مشاورت کا ہے کہ مختلف معاملات و امور میں پہلے باہم مشورہ کیا جائے، اس کے لیے لائحہ عمل متعین کیا جائے اور پھر یہ طے کرنے کے بعد اس مقصد کے لیے دل و جان سے جدوجہد کی جائے اور نتیجہ اللہ کے قوانین پر چھوڑ دیا جائے۔ تاہم یہاں یہ یاد رہے کہ اللہ کے قوانین سے بھی مدد اسی صورت حال ہو گی جب یہ سارا عمل ان قوانین کی مطابقت میں ہو گا۔ اگر یہ پورا عمل اللہ کے

قوانین کی مخالفت میں جاری ہو تو بھی ظاہر ہے اس صورت میں اللہ کے قوانین سے مدد ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس صورت حال کو ایک بالکل سادہ سی مثال کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔ دریاؤں اور سمندروں میں جو بھی کشتیاں اور جہاز تیرتے ہیں وہ سادہ طور پر ایک خاص قدرتی قانون کے تحت تیرتے ہیں جسے اصول ارشمیدس کہا جاتا ہے۔ اب اگر ایک شخص ایک کشتی یا جہاز اس اصول کے تحت بناتا ہے تو ظاہر ہے اس کے تیرنے میں کسی قسم کی کوئی مشکل نہیں ہو گی کیونکہ اس میں اس بنیادی اصول کو سامنے رکھا گیا ہے لیکن اگر یہ منصوبہ بندی کی جائے کہ اس بنیادی اصول سے انحراف کرتے ہوئے کوئی جہاز یا کشتی تیار کی جائے تو ظاہر ہے وہ تیر نہیں سکے گی اور ڈوب جائے گی کیونکہ اس میں بنیادی قدرتی قانون سے انحراف کیا گیا ہو گا۔

لہٰذا درحقیقت توکل سے مراد بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں: اول ارادہ اور جدوجہد اور دوم اس سعی کا قدرتی قانون / قوانین سے ہم آہنگ ہونا۔ یہ دونوں شرائط لامحالہ مطلوبہ نتائج فراہم کر دیں گی۔

یہاں ایک بہت اہم بلکہ بنیادی نکتہ یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ از روئے قرآن شیطان انہی لوگوں پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے جو اللہ پر توکل نہیں کرتے یعنی جنہیں یا تو اللہ کے قوانین کا یا تو سرے سے علم نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو ان پر یقین نہیں ہوتا۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٩٨﴾ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾

"جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کیا کرو۔ اہل ایمان اور اپنے رب پر توکل کرنے والوں پر اس کا کوئی بس نہیں چلتا۔ ہاں اس کا غلبہ ان لوگوں پر ہے جو اسے سرپرست بنالیں اور جو (اس کے بہکاوے میں آکر) شرک کرنے لگیں۔" (سورۃ النحل:۹۸- ۱۰۰)

گویا ایسے لوگ جو اللہ کے قوانین پر کامل یقین رکھتے ہیں ان پر شیطانی وسوسوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اللہ کے قوانین، ان کی حقانیت، طریقہ کار اور

انجام کا علم ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ برے افعال انجام دیں گے یا ظلم کریں گے یا کسی بھی نوع کے افعال بد انجام دیں گے تو از روئے قرآن ان کا اس دنیا اور آخرت میں انجام کیا ہوگا اور کن بدترین ذلتوں، رسوائیوں اور مشکلات و عذاب کا شکار ہو سکتے ہیں لہذا وہ شیطان کے بہکاوے میں آتے ہی نہیں۔ ان کے دل میں کبھی یہ شبہ یا خیال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ اگر ہم فلاں جرم / ظلم وغیرہ کرلیں خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو تو شاید ہم پر اس کا عذاب نازل نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہے انہیں معلوم ہے کہ اللہ کے قوانین اپنے اطلاق میں بہت بے رحم ہیں لہذا وہ ان سے انحراف کا تصور بھی نہیں کرتے۔

اس کے برخلاف ایسے لوگ جو مشرکین ہیں جو ایک خدا پر یقین نہیں رکھتے یا یوں کہہ لیجیئے کہ اللہ کے قوانین کی وحدانیت پر یقین نہیں رکھتے ان کے خیال میں یہ کائنات مختلف خداؤں میں بٹی ہوئی ہے تو لا محالہ ہر خدا کا اپنا ایک قوانین کا مجموعہ ہوگا دوسرے کا اپنا تو وہ اسی شش و پنج میں رہتے ہیں ان پر راہ ہدایت واضح نہیں ہوتی۔ جب قوانین اور ان کا نجام واضح نہ ہو تو ذہن شیطان کی چراگاہ بن جاتا ہے اور وہ ایسے لوگوں کو آسانی سے جرائم / ظلم یا افعال بد کی جانب راغب کرلیتا ہے کیونکہ ایسے لوگوں کو جرم اور اس سے متعلق قوانین کی حقانیت پر یقین نہیں ہوتا لہذا مشرکین با آسانی شیطان کا شکار بن جاتے ہیں۔

یاد رکھیئے اللہ کے قوانین جس طرح خارجی دنیا میں جاری و ساری ہیں اسی طرح انسانی دنیا میں بھی ہیں۔ انسانوں کی دنیا سے متعلق قوانین قرآن مجید میں بیان کر دیئے گئے ہیں ان کی نتیجہ خیزی پر بھی اسی طرح بھروسہ کیا جاسکتا ہے جس طرح خارجی دنیا سے متعلق قوانین پر کیا جاتا ہے اسی کا نام توکل علی اللہ ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٢﴾

"مومن تو وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیات (قوانین الہی) پڑھی جاتی ہیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔"

(سورۃ الانفال:۲)

باالفاظ دیگر مومنین کی منجملہ خصوصیات میں سے ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قوانین پر مکمل اور کامل ایمان رکھتے ہیں جب انہیں ان قوانین کی بابت بتایا جاتا ہے تو یہ علم ان کے ایمان میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

مقام تدبر یہ ہے کہ آخر حضور اکرم (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں (صحابہ کرام) کے پاس آخر ایسی کون سی قوت تھی جو وہ مکی دور میں کفار کے بے پناہ مظالم برداشت کرتے رہے۔ مدینہ میں یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کو ناکام بنایا اور پھر تقریباً چوتھائی سے زائد دنیا پر اپنی فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یقیناً یہ اللہ اور اللہ کے قوانین پر یقین کی لازوال دولت تھی جس کی وجہ سے یہ سب ممکن ہوا۔

یہ ایک سیدھی سادی سی نفسیاتی حقیقت ہے۔ فرض کیجیے دو افراد الف اور ب ہیں۔ دونوں دو مختلف امور کا بیڑہ اٹھاتے ہیں۔ الف کو اپنے مقصد کی سچائی، حکمت عملی پر یقین کامل ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کا کام مثبت نتائج کا حامل ہو گا ظاہر ہے کامیابی الف کو حاصل ہو گی۔ اس کے برعکس جہاں تک ب کا تعلق ہے اگر بالفرض اس کا مقصد بھی صحیح ہو لیکن اسے اس پر یقین نہ ہو، نہ اپنی حکمت عملی پر اعتبار ہو، نہ اسے ان قوانین کی صحت پر اعتماد ہو جن کی وجہ سے اس کی محنت ثمر بار ہو گی تو ظاہر ہے ب کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

غور کیجیے تمام انبیاء کرام کی ہمت، حوصلے، بلند نگہی اور عزم کے پیچھے ان کی اللہ کے قوانین کی صداقت پر یقین کی دولت تھی۔ قرآن مجید میں اس حوالے سے مختلف انبیاء کرام کے توکل کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت نوح علیہ السلام کے حوالے سے کہا گیا کہ:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ ۘ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ۝

"آپ انہیں نوح (علیہ السلام) کا احوال سنائیں جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اگر تم کو میرا رہنا اور اللہ کے قوانین کا ذکر کرنا بھاری معلوم ہوتا ہے تو میرا تو اللہ پر بھروسہ ہے تم اپنی تدبیر مع اپنے شرکاء کے پختہ کر لو پھر تمہاری

تدبیر تمہارے لیے گھٹن کا باعث نہیں ہونی چاہیے پھر (جو چاہو) میرے ساتھ کر گذرو اور مجھ کو مہلت نہ دو۔" (سورۃ یونس:۷۱)

اندازہ کیجیے پوری قوم حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے ان کے مخالفت میں اندھی ہو چکی ہے لیکن اللہ کے یہ جلیل القدر نبی پورے اعتماد کے ساتھ اپنی پوری قوم کو بانگ دُھل چیلنج دے رہے ہیں کہ تم جو چاہو تدبیر کرلو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو۔ آخر یہ عزم، حوصلہ، اعتماد کس بنیاد پر تھا؟ ظاہر ہے یہ ایمان اور اللہ کے قوانین کی صداقت پر کامل علم کی نشانی تھی۔ مزید مقام تدبر یہ ہے کہ ایک پوری قوم صرف ایک شخص کے خلاف کچھ بھی کیوں نہ کر سکی؟ صرف اس لیے کہ ان کی قوم جو فعل انجام دے رہی تھی وہ باطل تھا، انہوں نے اپنے لیے جو خدا بنا رکھے تھے وہ باطل تھے اور ان باطل خداؤں پر خود ان کو بھی یقین نہ تھا تو اعمال میں نتیجہ کہاں سے پیدا ہوتا۔

صرف حضرت نوح علیہ السلام پر کیا موقوف عزم و ہمت کے یہ جواہر اور درخشاں مثالیں کئی ہیں۔ حضرت ھود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو یہی کہا تھا:

ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ ؕ

"اور مجھے بالکل مہلت نہ دو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے جو میرا اور تم سب کا رب ہے۔" (سورۃ ھود:۵۵-۵۶)

یہی عزم و استقلال حضرت شعیب علیہ السلام کے حوالے سے بھی ہمیں نظر آتا ہے جب انہوں نے اپنی قوم کو کہا:

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَرَزَقَنِیْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ ﴿۸۸﴾

"کہا اے میری قوم دیکھو! تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل لیے ہوئے ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے بہترین روزی دے رکھی ہے۔ میرا یہ ارادہ بالکل نہیں کہ تمہارے خلاف کر کے خود اس چیز کی طرف جھک جاؤں جس

سے تمہیں روک رہا ہوں میرا ارادہ تو اپنی بساط بھر اصلاح کرنے کا ہے۔ میری توفیق اللہ ہی کی مدد سے ہے، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔" (سورۃ ھود:۸۸)

حضرت ابراھیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو یہی کہا تھا:

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ

"(اے میری قوم!) میں تم سے اور ان سے جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر محکومی اختیار کیئے ہوئے ہو (بالکل) بیزار ہوں اور ان کا انکار کرتا ہوں جب تک تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہ لاؤ ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لیے بغض وعداوت ہے۔"
(سورۃ الممتحنہ:۴)

یہ صورتحال عمومی طور پر تمام انبیاء کرام کے ساتھ بھی تھی جس کا تذکرہ (سورۃ ابراہیم:۱۱۔۱۲) میں کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے غیر معمولی استقلال کی گواہی (سورۃ الزمر:۳۸۔۴۰) میں دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان معنوں میں وکیل ہے کہ اس کائنات کا وہ واحد مالک و مختار ہے۔ اس کے تمام قوانین اس نے اپنی مشیت سے طے کیئے ہیں۔ یہ قوانین اس کی مخلوقات کی فلاح کے لیے ہیں لہذا جب ایک شخص اللہ اور اس کے قوانین کی اطاعت کرتا ہے تو گویا وہ فلاح کی راہ کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔ وہی ہر شے کا نگہبان ہے لہذا عبدیت بھی اسی کی واجب ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾

"یہ ہے اللہ تمہارا رب! اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو تم اسی کی عبدیت اختیار کرو وہی ہر شے کا محافظ اور نگراں ہے۔" (سورۃ الانعام:۱۰۲)

یقیناً اللہ کی نگہبانی انسانوں کے لیے بہت کافی ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملک میں ہے اور وہ اس کی نگہبانی اور کارسازی بہت کافی ہے۔" (سورۃ النساء:۱۳۲)

لہذا مومنین کو صرف اور صرف اللہ اور اس کے قوانین پر بھروسہ رکھنا چاہیے اس سے ماسوا کسی پر بھی نہیں۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴿۹﴾

"مشرق و مغرب کا رب اس کے سوا کوئی الہ نہیں پس تم اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔"

(سورۃ المزمل:۹)

یہی حکم بنی اسرائیلیوں کو بھی دیا گیا تھا۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ﴿۲﴾ؕ

"اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی، اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا (اور حکم دیا کہ) میرے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بنانا۔" (سورۃ بنی اسرائیل:۲)

ظاہر ہے یہی حکم مسلمانوں کے لیے بھی ہے۔ اللہ نے انہیں قرآن مجید فرقان حمید جیسی کتاب عطا کی اور انہیں بھی یہی حکم دیا گیا کہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا کارساز نہ بنائیں یعنی اطاعت صرف اور صرف اللہ کی اور اس کے احکامات کی ہے یعنی قرآن مجید کی اطاعت اور اس کتاب میں بیان کردہ اصولوں و قوانین کی صداقت پر یقین اور صرف اور صرف اللہ کو اپنا وکیل ماننا۔

* *

باب۔ 5

اللہ کے قوانین سے انحرافات کی بابت قوانین

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے قوانین پر عمل درآمد کے نتائج کا تعلق ہے ان پر گذشتہ ابواب میں بحث کی جاچکی ہے۔ تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان قوانین پر سرے سے عمل نہیں کرتے یہ وہ لوگ ہیں جو مکمل خسارے میں رہ جانے والے ہیں اور انسانوں کی بہت بڑی اکثریت اسی زمرے میں آتی ہے۔ اس حقیقت کو قانون خسران کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ تاہم ایک ایسی صورتحال جس میں راہ حق پر چلنے والے اگر راہ سے بھٹک جائیں اور پھر واپس آنا چاہیں یعنی گذشتہ افعال سے توبہ کرنا چاہیں ان کے حوالے سے قانون کو قانون انابت کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ تاہم یہ رجوع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان واپسی کے لیے خود اپنے نفس میں تبدیلی نہ لے کر آئے۔ یہ صورت حال انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر اس حوالے سے قانون ایک ہی ہے۔ تبدیلی کی اس خواہش کا اللہ کا قانون احترام کرتا ہے اور اسے قانون تغیر نفس کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

ا- قانون خسران

جہاں تک قرآن مجید کے اس قانون کا تعلق ہے یہ ایک بہت اہم اور بنیادی قانون

ہے۔اس قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "ایسے لوگوں کے علاوہ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ انجام دیئے اور ایک دوسرے کو صبر اور حق کی تلقین کرتے رہے باقی پوری نوع انسانی خسارے میں ہے۔"

اس قانون کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس قانون کی مختلف اصطلاحات یعنی ایمان، اعمال صالحہ، صبر، حق اور خسارے کو سمجھنا ضروری ہے۔ گذشتہ مباحث میں ان میں سے اول الذکر چار کی وضاحت مختلف مقامات پر کی جاچکی ہے۔ فی الوقت اس حوالے سے آخری اصطلاح یعنی خاسرین کی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

لفظ خسارہ کا مادہ خ، س، ر ہے۔ اس کے معنی گم ہو جانے، ہلاک ہو جانے، کمی، نقص یا خسارہ یا گھاٹے کے ہیں، اس میں عقل و فکر، صحت، ایمان اور عقیدے سے محرومی یا اس سے ہاتھ دھو بیٹھنا بھی شامل ہے۔ الخاسر سے مراد گم کردہ راہ، ہلاک ہو جانے والا یا ناکامیاب شخص ہوتا ہے اس میں عقل اور مال دونوں کا کھو جانا شامل ہے۔

از روئے قرآن روزِ قیامت تمام انسانی اعمال کا وزن ہو گا۔ ایسے لوگ جن کی نیکیوں کا وزن ان کی برائیوں سے زائد ہو گا وہ کامیاب ہوں گے اور جنتی ہوں گے جبکہ اس کے برعکس ایسے لوگ جن کی نیکیوں کا وزن ان کی برائیوں سے کم ہو گا یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی برائیوں کا پلہ بھاری ہو گا وہ ناکامیاب اور خاسر ہوں گے انہی لوگوں کے لیے قرآن مجید خاسرین کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس حوالے سے کچھ ایسے بدبخت بھی ہوں گے جن کی نیکیوں کا میزان صفر ہو گا یعنی ان کے پاس سوائے بدیوں کے اور کچھ بھی نہیں ہو گا یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے لیے سرے سے میزان کھڑی کرنے کے ضرورت ہی نہیں ہو گی کیونکہ نیکیوں کے کھاتے میں کچھ ہو گا ہی نہیں تو وزن کرنے کا کیا سوال؟ یہ لوگ بھی خاسرین میں شامل ہوں گے بلکہ بدترین خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔ اس حوالے سے ایک اور بنیادی قرآنی قانون یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ ایسے اعمال صالحہ جو بغیر ایمان کے انجام دیئے جائیں ان کی منفعت کام کرنے والے کو اسی دنیا میں دے دی جاتی ہے اور آخرت میں ان کا سرے سے کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ اس امر کا اثبات ان متعدد آیات قرآنی سے بخوبی ہو سکتا ہے جن میں آخرت کی کامیابی یا جنت کے حصول کو ایمان اور اعمال صالحہ

سے مشروط کیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

"جو لوگ ایمان لائیں اور اعمال صالحہ کریں وہ جنتی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" (سورۃ البقرۃ:۸۲)

گویا حصول جنت کے لیے بیک وقت دونوں شرائط کی تکمیل لازمی ہے، کسی ایک کی عدم موجودگی سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کو مزید واضح انداز میں ان آیات قرآنی میں بیان کیا گیا ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ﴿۹﴾ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾

"بلاشبہ یہ قرآن ایک ایسی راہ دکھاتا ہے جو بالکل ہی سیدھی ہے اور ایمان والوں کو جو اعمال صالحہ انجام دیں اس بات کی خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور یہ کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔" (سورۃ بنی اسرائیل:۹-۱۰)

یہاں یہ امر واضح کر دیا گیا کہ ایسے لوگ جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے ان کے لیے روز قیامت ماسوا عذاب اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اب اس انتہائی کڑے اور سخت معیار کو سامنے رکھیئے اور پوری نوع انسانی کی تاریخ کا صرف اس حوالے سے جائزہ لیجیئے کہ ہر دور میں ایسے کتنے افراد ہوں گے جو اس انتہائی سخت اور کڑے معیار پر پورے اترتے ہوں گے؟ یقیناً بہت کم جبکہ بقیہ انسانوں کی غیر معمولی اکثریت جن میں یقیناً نام نہاد قسم کے صرف منہ زبانی کلمہ گو قسم کے مسلمان بھی شامل ہیں اعمال صالحہ سے کتنے دور ہیں اس کی صراحت کی یقیناً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسانوں کی بڑی اکثریت اول تو قیامت پر یقین نہیں رکھتی اور جو یقین رکھتے ہیں ان کی بھی بڑی تعداد دل سے اس یقین کی حامل نہیں ہوتی لہٰذا اعمال صالحہ کی جانب رغبت اور کم ہو جاتی ہے۔ اس صورتحال میں ہر دور کے انسانوں کے افعال کا تجزیہ کیا جائے تو

ظاہر ہے انسانوں کی بہت بڑی اکثریت ان انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے جو قرآنی اصطلاح میں خاسرین ہیں۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جو قرآن مجید کی سورۃ العصر میں بیان کی گئی ہے۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

"قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے ماسوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اعمال صالحہ کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔" (سورۃ العصر:۱-۳)

ان آیات کریمہ کی رو سے صرف وہ لوگ اس خسارے سے بچنے والے ہیں جو ایمان کے حامل ہوں، اعمال صالحہ انجام دیں اور ایک دوسرے کو صبر اور حق کی تلقین کرتے رہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام انسان خواہ ان کا تعلق کسی بھی دور، کسی بھی علاقے سے ہو وہ وقت کے کسی بھی دورانیے میں زندہ ہوں وہ صرف اور صرف خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

۲- قانون انابت

ازروئے قرآن تمام انسانی اعمال خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ان کے نتائج ایک خاص وقت کے بعد انسانوں کے سامنے آتے ہیں۔ اس حوالے سے جہاں تک برے نتائج کا تعلق ہے اس حوالے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی صفت رحیمیت اور رحمانیت کی وجہ سے انہیں اعمال بد کے حتمی نتائج سے پہلے تک رجوع کرنے اور راہ راست پر آنے کے مواقع فراہم کرتا ہے جو انسان اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے افعال بد سے توبہ کرلیں اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرلیں وہ عذاب خداوندی سے بچ جاتے ہیں اور جو ایسا نہ کرسکیں وہ اپنے غلط افعال کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اس بنیاد پر قانون انابت کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ "اعمال بد کے برے نتائج کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اگر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرلیا جائے یعنی توبہ کرلی جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے قانون کی شرائط کی تکمیل سے مشروط توبہ قبول کرلیتا ہے۔" اس حوالے سے دو اصطلاحات پر تدبر لازمی ہے: اول توبہ اور دوم استغفار۔ ان دونوں کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

توبہ اور استغفار

جہاں تک لفظ توبہ کا تعلق ہے اس کا مادہ ت، و، ب ہے۔ اس کے معنی واپس آجانے کے ہیں یعنی انسان کا اپنے گناہوں پر نادم اور پشیمان ہو کر اللہ کی جانب رجوع کرنا۔ باالفاظ دیگر کسی بھی غلط روش یا طرز عمل کو چھوڑ کر راہ ہدایت اختیار کرنا، توبہ کہلاتا ہے۔

توبہ کی شرائط

ازروئے قرآن توبہ کی مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

۱) رجوع یا نفس امارہ پر قابو یا اس پر حاوی ہونا

۲) تلافی / اصلاح

۳) ابلاغ (یہ شرط صرف اہل علم کے لیے ہے)

۴) توبہ صرف ان افعال کی ہے جو بربنائے جہالت ہوں اور رجوع بھی جلد کیا جائے جہاں تک اس حوالے سے پہلی دو شرائط کا تعلق ہے ان کا بیان قرآن مجید میں متعدد مقامات پر موجود ہے۔ مثلاً:

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا

"جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے جو رجوع کرنے کا مقام ہے۔" (سورۃ الفرقان:۷۱)

گویا توبہ کی دو بنیادی شرائط ہیں: اول اللہ کی جانب رجوع کرنا اور دوم اصلاح۔ ظاہر ہے اس پورے عمل کے لیے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی وہ واحد ہستی ہے جس سے اس مقصد کے لیے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک رجوع کا تعلق ہے اس سے مراد صرف منہ سے کہہ دینا کافی نہیں کہ میں نے توبہ کی۔ اس مقصد کے لیے پہلے دل کی گہرائیوں سے سابقہ اعمال بد پر ندامت اور ان اعمال بد کی وجہ بننے والے نفسِ امارہ پر مکمل کنٹرول بھی شامل ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ نے گوسالہ پرستی اختیار کی اور بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر اپنے طرز عمل سے توبہ کی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىٕكُمْؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝۵۴

"جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنے نفوس پر ظلم کیا ہے اب تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اپنے نفوس کو جھکا دو تمہاری بہتری اللہ کے نزدیک اسی میں ہے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی وہ توبہ قبول کرنے والا رحم و کرم کرنے والا ہے۔"

(سورۃ البقرۃ:۵۴)

یہاں توجہ طلب امر یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں پہلے یہ کہا گیا کہ اپنے رب کی طرف رجوع کرو یعنی اس سے معافی کے خواستگار بنو پھر کہا گیا کہ اپنے نفوس کو جھکا دو یعنی اپنے نفسِ امارہ پر مکمل قابو پاؤ کیونکہ اللہ کے نزدیک یہی بہتری کی راہ ہے۔ یہاں واضح رہے کہ لفظ قتل کا مادہ ق، ت، ل ہے۔ اس کے معنی کسی شخص کو جان سے مارنے کے ساتھ جھکا دینے، ذلیل کرنے، حقیر کرنے کے بھی ہیں۔ یہاں قتل سے مراد کسی کو جان سے مارنا نہیں بلکہ اپنے نفوس (امارہ) کو جھکا دینے کے ہیں تاکہ خرابی کی جڑ پر قابو پایا جا سکے۔

اس ضمن میں دوسرا اصول اصلاح کا ہے۔ اصلاح سے مراد یہ ہے کہ ماضی میں انسان نے اپنے افعال بد سے جتنا بھی فساد پیدا کیا یا جو بھی ظلم کیا ہے اس کی اصلاح کرے۔ اس اصلاح کا ذریعہ زیادہ سے زیادہ حسنات یا نیکیاں ہیں۔ اس حوالے سے بنیادی قرآنی قانون مندرجہ ذیل ہے۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِؕ

"بے شک حسنات (نیکیاں) برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔" (سورۃ ھود:۱۱۴)

لفظ حسنات کا مادہ ح، س، ن ہے۔ اس کے معنی صحیح تناسب و توازن کے ہیں جبکہ یذھبن کا مادہ ذ، ھ، ب ہے۔ اس کے معنی چلے جانے یا گذر جانے کے ہیں۔ اس کے علاوہ زائل کرنے، چھین لینے، ختم کر دینے یا لے جانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ آخری الذکر لفظ سیاٰت کا مادہ س، و، ء ہے۔ اس کے معنی کسی ناخوشگوار بات، ناہمواری، عدم توازن، ابتری یا بگاڑ پیدا کرنے

کے ہیں۔ اس بنیاد پر سیدھا سا مشیت ایزدی کا قانون یہ ہے کہ "توازن عدم توازن کو ختم کر دیتا ہے۔" گویا اصلاح سے مراد یہ ہو گی زیادہ سے زیادہ ایسے افعال کی انجام دہی جن سے انسان کی داخلی یا خارجی دنیا میں توازن پیدا ہو۔ بالفاظ دیگر اعمال صالحہ کی انجام دہی، یہ اس حوالے سے دوسری بنیادی شرط ہے۔ جہاں تک ابلاغ کا تعلق ہے یہ شرط اہل علم کے لیے ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓىٕكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓىٕكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۰﴾

"جو لوگ ہماری اتاری ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم انہیں اپنی کتاب میں لوگوں کے لیے بیان کر چکے ہیں ان لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے مگر وہ لوگ جو توبہ کر لیں اور اصلاح کریں اور بیان کریں تو میں ان کی توبہ قبول کر لیتا ہوں اور میں توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہوں۔" (سورۃ البقرہ: ۱۵۹-۱۶۰)

اگر ان دونوں آیات کریمہ پر غور کیا جائے تو یہاں واضح طور پر بیان ان اہل علم کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دلائل اور آیات یا کتاب کا علم عطا کیا لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس کا زیادہ سے زیادہ ابلاغ کرتے انہوں نے اس علم کو اپنے آپ تک محدود کر لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کی بلکہ تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت و ملامت کا نشانہ بن گئے۔ لیکن اگر ان میں کوئی ایک یا زائد اپنی غلطی کا ادراک کر لیں اور اپنے اس عمل سے رجوع کرنا چاہیں تو غور کیجیے آیت (سورۃ البقرہ: ۱۶۰) میں توبہ اور اصلاح کے ساتھ ایک تیسری شرط کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہونے والے علم کا زیادہ سے زیادہ ابلاغ، ان کی توبہ اس صورت میں قبول ہو گی جب وہ پہلی دو شرائط کے ساتھ اس تیسری شرط کی بھی تکمیل کریں گے۔

ازروئے قرآن توبہ صرف ان افعال کی ہے جو بربنائے جہالت ہوں اور رجوع بھی جلد کیا جائے۔ اس قانون کو ان الفاظ میں قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے:

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓـئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۝۱۷

"اللہ تعالیٰ توبہ صرف انہی لوگوں کی قبول کرتا ہے جو بربنائے جہالت کوئی برائی کر بیٹھیں اور پھر جلد ہی اس سے باز بھی آجائیں اور توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا ہے اور بے شک اللہ بہت علم والا حکمت والا ہے۔" (سورۃ النساء:۱۷)

توبہ کی قبولیابی

ازروئے قرآن توبہ اس وقت قبول ہوتی ہے جب خطاکار اس امر کا ادراک کرلے کہ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے اور وہ اللہ سے رجوع کرلے۔ اس حقیقت کو سورۃ توبہ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيۡنَ خُلِّفُوۡا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ وَضَاقَتۡ عَلَيۡهِمۡ اَنۡفُسُهُمۡ وَظَنُّوۡۤا اَنۡ لَّا مَلۡجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيۡهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوۡبُوۡا‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ۝۱۱۸

"اس طرح ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کردیا گیا تھا یہاں تک کہ زمین اپنی تمام تر فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کے نفس ان پر بار بن گئے اور انہوں نے خیال کیا کہ اللہ کے غضب سے بچنے کے لیے سوائے اس کے کوئی اور پناہ نہیں پھر اللہ نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں، بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔" (سورۃ التوبہ:۱۱۸)

وہ لوگ جن کی توبہ قبول ہوتی ہے

قرآن مجید پر تدبر سے ہمیں ایسے لوگوں کے بارے میں علم ہوتا ہے جن کے متعلق یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ ازروئے قرآن یہ لوگ مندرجہ ذیل ہیں:

۱) فاسقین

ایسے لوگ جو پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں اور پھر چار گواہ سامنے نہ لائیں ان کی

سزا سی کوڑے ہے اور ان کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ انہیں قرآن مجید میں فاسق قرار دیا گیا ہے (سورۃ النور:۴) تاہم اگر یہ رجوع کریں تو اللہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (سورۃ النور:۵)

۲) **ظالمین**

یوں تو ظلم کی کئی مختلف اقسام ہیں تاہم ایسے لوگ جو ایمان لانے کے بعد مرتد ہو جائیں ایسے ظالم لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا (سورۃ آل عمران:۸۶) تاہم ان میں سے کوئی اپنی اصلاح کر لے تو اس کی توبہ کی قبولیابی ممکن ہے۔ (سورۃ آل عمران:۸۹)

۳) **بے حیالوگ**

ایسے مرد و خواتین جو بے حیائی کے مرتکب ہوں تو ان کے حوالے سے بھی توبہ کی قبولیابی کا امکان ہے۔ (سورۃ النساء:۱۵۔۱۶)

۴) **سارق**

سارق مرد یا عورت اگر توبہ کر لے اور راہ ہدایت اختیار کر لے تو بھی اسے اللہ کی رحمت کی آس رکھنی چاہئے۔ (سورۃ المائدہ:۳۸۔۳۹)

وہ لوگ جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی

ازروئے قرآن کچھ ایسے بھی بدبخت ہوتے ہیں جو ایسے افعال انجام دیتے ہیں جن کی وجہ سے وہ خود اپنے اوپر توبہ کے دروازے بند کر لیتے ہیں، اس قسم کے حرمانِ نصیب مندرجہ ذیل ہیں:

i) ایسے لوگ جو ایمان لانے کے بعد کفر کریں اور پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے جائیں (سورۃ آل عمران:۹۰)

ii) ایسے لوگ جو مسلمانوں پر طعنہ زنی کرتے ہوں یا ان کا مذاق اڑاتے ہوں، یہ اللہ اور اس کے رسول سے کفر کے مترادف ہے۔ (سورۃ التوبہ:۷۹۔۸۰)

iii) منافق لوگ جو ایمان لا کر کافر ہو گئے جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے جو انتہا درجے کے متکبر ہیں۔ (سورۃ المنافقون:۳۔۶)

iv) ایسے لوگ جو برائیاں ہی کرتے چلے جائیں اور مرتے وقت توبہ کے طالب ہوں یا ایسے لوگ جو حالت کفر میں ہی مر جائیں۔(سورۃ النساء:۱۸)

ان تمام لوگوں کی ازروئے قرآن کوئی توبہ قبول نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت تمام نوع انسانی کے لیے ہمیشہ سے ہے اور تا قیامت رہے گی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾

"ہم نے تمام رسولوں کو اس لیے بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے، اگر یہ لوگ جنہوں نے اپنے نفوس پر ظلم کیا تھا آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو یقیناً یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا رحیم پاتے۔" (سورۃ النساء:۶۴)

اللہ تعالیٰ نہ صرف توبہ قبول کرنے والا ہے بلکہ اس میں کامل بھی ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

"کیا ان کو خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے، وہی صدقات کو قبول کرتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے میں اور رحمت کرنے میں کامل ہے۔" (سورۃ التوبہ:۱۰۴)

اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا تذکرہ (سورۃ التوبہ:۱۱۸)،(سورۃ النور:۱۰)،(سورۃ المومن:۳) اور (سورۃ الحجرات:۱۲) کے علاوہ دیگر متعدد مقامات پر بھی کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (سورۃ البقرہ:۲۲۲)

۲-استغفار

اس حوالے سے جہاں تک استغفار کا تعلق ہے اس کا مادہ غ، ف، ر ہے۔ اس کے معنی کسی کو ایسی شے پہنا دینا ہے جس سے وہ غلاظت وغیرہ سے محفوظ رہے، اس میں چھپانے اور محفوظ رکھنے کا مفہوم شامل ہے۔ کفر کے معنی چھپانا یا پردہ ڈالنے کے ہیں۔ اسی سے مغفرۃ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ کوئی فرد یا قوم اپنے اعمال بد کے منفی اثرات کے نتیجے میں تباہ ہو جائے اگر وہ فرد یا قوم اس حتمی تباہی سے پہلے اللہ کی جانب یا راہ ہدایت کی طرف اپنا رخ پھیر لے تو اللہ اسے اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے یعنی اس فرد / قوم کو ان کے اعمال بد کے منفی اثرات سے محفوظ کر دیتا ہے، لیکن یہ اسی وقت ہوتا ہے جب فرد یا قوم صمیم قلب سے اللہ کے حضور توبہ کرے، اعمال صالحہ کا عہد کرے اور صرف عہد ہی نہیں اس پر مسلسل تواتر کے ساتھ عمل بھی کرے، اسی بنیاد پر اللہ کی صفات میں سے ایک صفت غفار (سورۃ النوح:۱۰) بھی ہے اس کے معنی ہیں حفاظت دینے والا، محفوظ رکھنے والا۔

توبہ و استغفار کے نتائج

مشیت ایزدی کے طے شدہ قانون کے مطابق توبہ و استغفار کا نتیجہ اللہ کا فضل ہے اور مال و متاع کی فراوانی ہے اور ہر عمل کا اس سے کہیں بہتر اور اعلیٰ ثمر ہے جبکہ اس سے اعراض کا نتیجہ دنیاوی اور اخروی تباہی ہے۔ اس حقیقت کو ایک عمومی کلیے کی شکل میں سورۃ ھود کی مندرجہ ذیل آیت میں بیان کیا گیا ہے:

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳

"اور یہ کہ تم اپنے رب کے حضور استغفار کرو اور اس کی طرف رجوع کرو وہ تمہیں ایک مقررہ وقت تک زندگی کی بہترین متاع عطا کرے گا اور ہر زیادہ عمل کرنے والے کو اس کا زائد اجر اور اگر تم اعراض کرو گے تو مجھے تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب کا خدشہ ہے۔" (سورۃ ھود:۳)

سورۃ النور میں اسے فلاح کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے:

وَتُوبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

"اور اللہ کے حضور اجتماعی توبہ کرو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔" (سورۃ النور:۳۱)

سورۃ التحریم میں اس عمل کے نتیجے میں برائیاں دور ہونے اور اس نتیجے میں جنت کی بشارت دی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

"اے اہل ایمان اللہ کے حضور توبہ کرو، خالص توبہ۔ کچھ بعید نہیں کہ تمہارا رب تم سے تمہاری برائیاں دور کردے اور تمہیں ایسی جنتوں میں لے جائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔" (سورۃ التحریم:۸)

توبہ استغفار سے افراد واقوام عذاب سے محفوظ رہتی ہیں:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾

"اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ جب آپ ان کے درمیان موجود ہیں تو ان کو عذاب دے اور نہ ہی اللہ ایسا ہے کہ وہ لوگوں کو عذاب دے جبکہ وہ استغفار کرتے ہوں۔" (سورۃ الانفال:۳۳)

باالفاظ دیگر توبہ و استغفار سے دنیا و آخرت دونوں کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں اور اعراض کا نتیجہ تباہی ہے۔ اس پوری بحث کے پس منظر میں قوموں کے حوالے سے ایک اساسی قانون یہ مرتب ہوتا ہے کہ کوئی بھی قوم اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلے میں خواہ تباہی کے بالکل کنارے پر ہی کیوں نہ کھڑی ہو اگر وہ توبہ و استغفار کرتی ہے تو اللہ کا قانون اسے اپنے دامانِ رحمت میں لے لیتا ہے اور اگر وہ متذکرہ بالا شرائط جو اس حوالے سے بیان کی گئی ہیں ان کی تکمیل کرتی ہے تو اس پر ایک خاص مدت تک اللہ کی رحمتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور برعکس صورت میں تباہی مقدر ہو جاتی ہے۔

۳- قانون تغیر نفس / احترام آرزو

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون دنیا کی کسی بھی قوم کے حوالے سے یہ ہے کہ "جب تک کوئی قوم خود اپنے نفوس میں تبدیلی پیدا نہ کرے اللہ بھی اس کے احوال کو تبدیل نہیں کرتا۔"
اس قانون کو جامع اور ٹھوس انداز میں قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ؕ

"بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کے نفوس کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے نفوس کو تبدیل نہیں کرتی۔" (سورۃ الرّعد:١١)

یہ الفاظ قرآنی سیدھے سادے انداز میں اس امر کی گواہی ہیں کہ تبدیلی کی ابتدا یا اس کا آغاز ہمیشہ انسان کی جانب سے ہوتا ہے۔ انسان جس طرح اپنے آپ کو بدلتا ہے بعینہ اسی طرح کی اللہ کی تقدیریں اس پر منطبق ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس قانون کی مزید وضاحت سورۃ الانفال کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے ہو سکتی ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۵۳﴾

"یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ کسی قوم کو کوئی نعمت عطا کر کے اسے بدل دے جب تک کہ وہ خود اپنے نفوس کو تبدیل نہ کر دیں، بے شک اللہ تعالیٰ ہر بات سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔" (سورۃ الانفال:۵۳)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ دنیا کی کسی بھی قوم کو کوئی بھی نعمت عطا کرتا ہے تو اسے اس قوم سے اس وقت تک واپس نہیں لیا جاتا جب تک وہ قوم اس نعمت کی ناشکری کر کے خود کو اس کا نا اہل نہ ثابت کر دے۔ اگر وہ قوم خود ناشکری میں تمام حدود پھلانگ جائے تو پھر اس سے وہ نعمت چھین لی جاتی ہے لیکن اگر وہ اس نعمت کی شکر گذاری کرتی رہے تو اللہ اپنی سنت کے تحت اس نعمت کو اس قوم سے واپس نہیں لیتا۔ جیسا کہ بنی اسرائیل اور دیگر اقوام کے ساتھ ہوا۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے دنیا جہاں کی بہترین نعمتیں عطا کی تھیں لیکن انہوں نے اللہ کے قوانین کی نافرمانی کی اور پوری قوم حدود اللہ فراموش کر بیٹھی،

نتیجے کے طور پر ان سے وہ تمام نعمتیں چھین لی گئیں۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝

"اسی ضابطے کے مطابق جو آل فرعون اور ان لوگوں پر (لاگو ہوا) جو ان سے پہلے تھے انہوں نے بھی اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تھا سو ہم نے انہیں ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا وہ سب لوگ ظالم تھے۔" (سورۃ الانفال:۵۴)

یہ اس قانون کا ایک پہلو تھا جس کے تحت اللہ تعالیٰ افراد و اقوام سے اس وقت تک کوئی نعمت واپس نہیں لیتا جب تک کہ وہ خود کو اس کا اہل ثابت کرتے رہیں۔ اس قانون کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی قوم خود اپنے اعمال بد کے سبب قعرِ مذلت میں جا گری ہو تو بھی اللہ تعالیٰ اس قوم کی طرف اس وقت تک توجہ نہیں دیتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر اپنی حالت کو تبدیل کرنے کی تڑپ پیدا نہیں کر لیتی۔ جب تک کسی قوم میں اپنے اندر اٹھنے، آگے بڑھنے اور اپنی حالت بہتر بنانے کی تڑپ پیدا نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ کا قانون بھی اسے مکمل نظر انداز کیئے رکھتا ہے۔ تاہم جب یہ تڑپ یا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے اور قوم میں خود آگاہی یا شعور پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ کا قانون بھی اس کی مدد کو آ جاتا ہے گویا پھر بھی ابتدا انسان کی جانب سے ہوتی ہے۔ انسان جو چاہتا ہے یا جیسی سعی کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی اسی قسم کی تقدیر اس پر منطبق ہو جاتی ہے۔

باب۔ 6

معاشی قوانین

جہاں تک معاشی قوانین کا تعلق ہے اس موضوع پر راقم الحروف کی ایک الگ کتاب بعنوان "رزق کی بست و کشاد کے قرآنی قوانین" موجود ہے۔ زیر نظر باب میں اسی کتاب میں پیش کیئے گئے قوانین کو ایک خلاصے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے ان قوانین کو دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: اول رزق کی کشاد اور دوم بستگی رزق کے قوانین۔ ان دونوں اقسام کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

رزق کی کشاد کے قوانین

جہاں تک قرآن مجید میں بیان کیئے گئے کشادگئی رزق کے قوانین کا تعلق ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلا قانون: احکام الٰہی کی اطاعت سے رزق کی کشادگی

جہاں تک رزق کی وسعت کا تعلق ہے اس حوالے سے پہلے قانون کا تعلق پوری بنی نوع انسانی سے ہے۔ اس ضمن میں بنیادی حکم اللہ کے احکامات کی تعمیل کا ہے یعنی انسانوں میں سے جو بھی، جب بھی ان احکامات الٰہی کی اطاعت کرے گا رزق کی کشاد ایک لازمی امر ہے۔ اس قانون کو ان الفاظ میں قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾

"اگر یہ لوگ تورات اور انجیل اور ان کی جانب جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ان کے پورے پابند رہتے تو یہ لوگ اپنے اوپر سے اور نیچے سے کھاتے۔ ان میں کچھ لوگ میانہ رو ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے اعمال برے ہیں۔" (سورۃ المائدہ:٦٦)

یہ آیت سیدھے سادے انداز میں اس امر کی شہادت ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات خواہ وہ ان کتابوں میں تھے جو اب تاریخ کا حصہ ہیں یا قرآن مجید میں ہوں ان پر جب بھی اور جہاں بھی عمل کیا جائے گا فراوانئ رزق اس کالازمی نتیجہ ہے۔ جہاں تک اوپر نیچے سے رزق کا تعلق ہے، اوپر سے مراد آسمان ہے یعنی حسب ضرورت خوب بارشیں اور نیچے سے مراد زمین ہے جس سے اچھی بارش کے نتیجے میں خوب پیداوار حاصل ہو۔ اس آیت کریمہ میں نہ صرف اہل کتاب بلکہ ان لوگوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جن پر کبھی کتابیں نازل ہوئیں ان کے حوالے سے یہ کہا گیا کہ یہ لوگ اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والے احکامات کی کامل اطاعت کرتے تو بے شمار رزق پاتے۔

قرآن مجید کے بعض احکامات ایسے ہیں جن کا حکم پوری نوع انسانی کو دیا گیا ہے، اگر کوئی بھی انسان ان احکامات کی تابعداری کرتا ہے تو اس قانون کے تحت اس کے لیے رزق کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد احکامات ایسے ہیں جن میں مختلف افعال سے مجتنب رہنے کا حکم دیا گیا ہے تاہم توجہ طلب امر یہ ہے کہ ان احکامات میں خطاب پوری نوع انسانی سے ہے کسی خاص گروہ انسانی سے نہیں۔ ان احکامات میں ربا سے مجتنب رہنے کا حکم (سورۃ البقرہ:٢٧٥)، حرام مال کھانے سے بچنا (سورۃ البقرہ:١٨٨)، ناپ تول پورا رکھنا (سورۃ البقرہ:١٥٢)، امانت میں خیانت نہ کرنا (سورۃ النساء:٥٨)، اسراف و تبذیر سے اجتناب (سورۃ بنی اسرائیل:٢٦)، رشوت سے بچنا (سورۃ البقرہ:١٨٨)، یتیموں کا مال ناجائز کھانے سے بچنا (سورۃ النساء:١٠) اور اللہ کی راہ میں اپنے مال کو کھلا رکھنا (سورۃ البقرہ:٢٤٥) اور (سورۃ الحدید:١١) وغیرہ شامل ہیں۔ نہ صرف یہ احکام بلکہ اس کے علاوہ بھی دیگر متعدد

احکامات کی تعمیل کا نتیجہ پوری نوع انسانی کے لیے فراواں رزق کی شکل میں نکلتا ہے۔ اس حوالے سے اللہ کا قانون انسانوں کے مابین کوئی تمیز روا نہیں رکھتا۔

دوسرا قانون: اللہ پر ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں باعزت رزق

جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے اس حوالے سے ان کے لیے رزق کی کشاد، اللہ پر ایمان اور اعمال صالحہ سے مشروط ہے۔ مزید برآں توجہ طلب امر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے رزق کو 'رزق کریم' کہہ کر اور غیر مسلموں کے رزق سے ممیز بھی کیا ہے یعنی ازروئے قرآن مومنین کو ایمان اور اعمال صالحہ سے مشروط جو رزق حاصل ہوتا ہے وہ باعزت رزق ہوتا ہے، غیر مسلموں کی طرح محض عام رزق نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کا اثبات مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾

"جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیئے ان کے لیے مغفرت اور باعزت رزق ہے۔" (سورۃ الحج:۵۰)

جہاں تک ایمان اور اعمال صالحہ کا تعلق ہے اس کی صراحت گذشتہ ابواب میں کی جاچکی ہے، گویا ایسے تمام لوگ جو ایمان لائیں اور اعمال صالحہ انجام دیں ازروئے قرآن ان کے لیے باعزت یا معزز رزق ہے اور اس کے ساتھ ان کے لئے مغفرت بھی اسی عمل سے ممکن ہوسکتی ہے۔ اس حقیقت کا اعادہ (سورۃ الرعد:۳۹)، (سورۃ الطلاق:۱۱) اور (سورۃ السباء:۳۔۴) میں بھی کیا گیا ہے۔

تیسرا قانون: اللہ سے ڈرنے والوں، توکل کرنے والوں، نمازیوں اور انفاق کرنے والوں کے لیے باعزت رزق ہے

مشیت ایزدی سے متعین شدہ رزق کی کشاد کے اس تیسرے قانون کے تحت اللہ سے ڈرنے والوں، اللہ پر توکل کرنے والوں، نمازیوں اور اپنے مال و دولت کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنے والوں کے لیے باعزت رزق ہے۔ اس قانون کو قرآن مجید میں سورۃ الانفال میں ان

الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٢﴾ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٤﴾

"مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ جو صلوۃ قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس (بڑے) درجات اور مغفرت اور باعزت رزق ہے۔" (سورۃ الانفال:۲۔۴)

یہاں اللہ سے ڈرنے سے مراد قوانین خداوندی کی کامل اطاعت اور ان کی خلاف ورزی سے بچنا ہے۔ توکل سے مراد اللہ کی راہ میں مسلسل سعی اور جدوجہد ہے۔ اس حوالے سے مومنین کی دیگر صفات میں صلوۃ کا قیام اور اپنے مال و دولت کو اللہ کی راہ میں مسلسل خرچ کرنا بھی ہے۔ ان افعال کے نتیجے میں اس آیت کی رو سے مومنین کو باعزت رزق عطا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے جہاں تک انفاق کا تعلق ہے، قرآن مجید میں اس پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے لہذا اس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

انفاق

انفاق سے مراد اپنے مال و دولت کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا ہے۔ قرآن مجید کا واضح حکم ہے کہ اپنی محنت سے حاصل شدہ کمائی میں سے جو بھی ضرورت سے زائد ہو وہ اللہ کی راہ میں دے دو۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ

"اور یہ پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا دے دیں؟ کہہ دیجیئے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔" (سورۃ البقرہ:۲۱۹)

باالفاظ دیگر تمام تر مال و دولت جو انسان کی جائز ضروریات سے زائد ہو اس کے متعلق

واضح طور پر کہہ دیا گیا کہ اسے اللہ کی راہ میں دے دو۔ یہاں غور طلب نکتہ یہ بھی ہے کہ قرآن مجید نے پوری نوع انسانی کے تمام افراد خواہ وہ مرد ہوں یا عورت ان کی کمائی کو خواہ وہ کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو اسے ان کی مکمل ملکیت میں تسلیم ہی نہیں کیا ہے، ان کی کل کمائی کے صرف ایک مخصوص حصے پر ان کی ملکیت تسلیم کی ہے پوری کمائی پر نہیں۔ اس حقیقت کا اثبات مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَاسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

"اس چیز کی آرزو نہ کرو جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مردوں کا اس میں حصہ ہے جو انہوں نے کمایا ہے اور عورتوں کے لیے اس میں حصہ ہے جو انہوں نے کمایا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو یقیناً اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔" (سورۃ النساء:۳۲)

اس آیت کریمہ کے حوالے سے اول تو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہاں خطاب تمام کمانے والے مردوں اور عورتوں سے یکساں ہے اور قرآن مجید کسی خاص گروہ انسانی سے مخاطب نہیں ہے۔ اس بنیاد پر یہ حکم تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس ضمن میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ منجملہ تمام مردوں اور عورتوں کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ ان کی کمائی میں ان کا حصہ ہے۔ یہاں واضح رہے کہ آیت میں حصے کے لیے لفظ نصیب آیا ہے۔ اس لفظ کا مادہ ن، ص، ب ہے۔ اس کے منجملہ دیگر معنوں میں ایک معنی متعینہ حصے کے ہیں اور ان معنوں میں یہ مادہ (سورۃ البقرہ:۲۰۲) اور (سورۃ النساء:۷) میں بھی آیا ہے۔

اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ازروئے قرآن پوری نوع انسانی کے تمام کمانے والے افراد خواہ وہ کتنا ہی کم یا زیادہ کمائیں ان کی آمدنی میں صرف ان کا ایک مخصوص حصہ ہے بقیہ رقم یا مال و دولت ان کی ہے ہی نہیں، اس پر قرآن مجید نے ان کا حق سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ یہ آمدنی یا مال و دولت دیگر لوگوں کی ہے جسے اللہ کی راہ میں کھلا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، جسے انفاق کہا جاتا ہے۔

اللہ کا حق

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھی جانی ضروری ہے کہ وہ رقم یا مال و دولت جو انفاق کرنے والے اللہ کی راہ میں ضرورتمندوں کو دیتے ہیں وہ ایسا کر کے کسی پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ ازروئے قرآن یہ اللہ کا حق ہے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ڮ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٤١﴾

"اور خدا ہی تو ہے جس نے باغ پیدا کیے چھتریوں پر چڑھائے ہوئے بھی اور جو چھتریوں پر نہیں چڑھائے ہوئے وہ بھی اور کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح کے پھل ہوتے ہیں اور زیتون اور انار (جو بعض باتوں میں) ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور (بعض حوالوں سے) نہیں، جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھل کھاؤ اور جس دن کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کر دو اور اسراف نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (سورۃ الانعام:۱۴۱)

اللہ کا یہ حق صرف زرعی پیداوار تک محدود نہیں بلکہ تمام ضرورت مندوں پر محیط ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿٢٦﴾

"اور قرابت والے (رشتہ دار) اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور کسی صورت اسراف نہ کرو۔" (سورۃ بنی اسرائیل:۲۶)

اللہ تعالیٰ کے اس حق کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ جو بھی مال و دولت انسان کی ضرورت سے زائد ہو اس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کا حق تسلیم ہی نہیں کیا ہے، وہ تو اللہ کا مال ہے جو اس کے ضرورتمند بندوں تک پہنچ جانا چاہیے۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ڰ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ

"اور وہ لوگ جن کو نکاح کی توفیق نہیں پاکیزگی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے اور تمہارے غلاموں میں سے جو لوگ مکاتبت کا مطالبہ کریں اگر تم ان میں ان کی بھلائی دیکھو تو ان سے مکاتبت کر لو (اور اگر ان کے پاس پورا مال نہ ہو) تو اللہ کے مال میں سے کچھ مال دے کر (ان کی آزادی ممکن بنا دو)۔" (سورۃ النور:۳۳)

اس آیت کریمہ میں جو نکتہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ پورے قرآن مجید کی یہ واحد آیت ہے جس میں مال کی نسبت اللہ کی طرف ہے "مال اللہ" (اللہ کا مال) جبکہ دیگر منجملہ تمام مقامات پر جہاں کہیں بھی مال کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کی نسبت کسی نہ کسی حوالے سے انسانوں سے ہی ہے جبکہ یہاں وہ مال جو گردنیں چھڑانے کی غرض سے ہو اس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ملکیت سرے سے تسلیم ہی نہیں کی ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ یہ اللہ کا مال ہے، گویا ہر وہ مال جو کسی ضرورتمند کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہو یا کسی حاجت مند کی حاجت پوری کرنے کے لیے ہو وہ مال انسانوں کا ہے ہی نہیں، اس پر ان لوگوں کا حق ہے جو صاحبِ استطاعت نہیں۔ اپنے زائد از ضرورت مال میں سے اللہ کا یہ حق اس کے ضرورتمند بندوں تک پہنچانا، انفاق کہلاتا ہے۔

شرائط انفاق

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انفاق کی کچھ شرائط بیان کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

الف) انفاق اللہ کی رضا کی خاطر ہونا چاہیے

انفاق کا بنیادی مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے، یہ کسی مالی اور مادی منفعت حاصل کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾ وَلَسَوْفَ یَرْضٰى ﴿۲۱﴾

"(ایسا متقی) جو اپنا مال تزکیہ حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہوتا جس کا بدلہ اتارنے کا اس کو خیال ہو ہاں مگر اپنے رب اعلیٰ کی

رضا حاصل کرنا (اس کا مقصود ہوتا ہے) اور وہ (خدا) ضرور اس سے راضی ہو جائے گا۔" (سورۃ الیل:۱۸۔۲۱)

ب) انفاق پاکیزہ اور عمدہ مال میں سے ہونا چاہیے۔

انفاق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پاکیزہ اور عمدہ مال میں سے ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

"اے اہل ایمان! جو تم نے کمایا ہے اس میں سے پاکیزہ مال کا انفاق کرو اور جو چیزیں ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں ان میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اور بری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرو کہ (اگر وہ چیزیں تمہیں دی جائیں تو) بجز اس کے کہ (لیتے وقت) آنکھیں بند کر لو اور ان کو کبھی نہ لو اور جان لو کہ اللہ غنی حمید ہے۔" (سورۃ البقرۃ:۲۶۷)

ج) انفاق دکھاوے کے لیے نہیں ہونا چاہیے

انفاق کے لیے تیسری بڑی شرط یہ ہے کہ انفاق کا مقصد دکھاوا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ کوئی بھی نیکی جو محض نمود و نمائش کے لیے کی جائے وہ محض ضائع چلے جانے والے اعمال میں شمار ہوتی ہے۔ لہٰذا انفاق کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے نہ کہ نمود و نمائش۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

"اے اہل ایمان! اپنے صدقات احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے (مال) کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس

پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے (اسی طرح) یہ (ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔" (سورۃ البقرۃ:۲۶۴)

د) پوشیدہ انفاق، ظاہری انفاق سے بہتر ہے

اگر انفاق پوشیدہ ہو تو زیادہ بہتر ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں جس پر احسان کیا جا رہا ہے اس کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی اور اس میں نمود و نمائش کا پہلو بھی نہیں ہوتا۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

"اگر تم صدقات ظاہراً دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور اہل حاجت کو دو تو وہ خوب تر ہے اس طرح کا دینا تمہاری بدیوں کو بھی دور کر دے گا اور اللہ کو تمہارے تمام کاموں کی خبر ہے۔" (سورۃ البقرۃ:۲۷۱)

ر) موت سے پہلے ہونا چاہیے

انفاق کے لیے مہلت صرف اس زندگی کی حد تک محدود ہے لہذا اس مہلت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھالینا چاہیے ایسا نہ ہو کہ عین وقتِ قضا دھیان آئے۔ ظاہر ہے اس وقت کچھ نہیں ہو سکے گا کیونکہ مہلت عمل کا وقت ختم ہو چکا ہو گا۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰﴾

"اور جو (مال) ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس (وقت) سے پیشتر خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کی موت آجائے (اس وقت) کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے اور تھوڑی سی مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں صدقہ کر لیتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا۔" (سورۃ المنافقون:۱۰)

س) آزمائش کے وقت کرنا بہتر ہے

کسی بھی ہنگامی صورت حال یا اچانک پیش آجانے والی مصیبت کے وقت خرچ کرنا، یہ

اس سے کہیں بہتر ہے کہ حالات نارمل ہو جانے کے بعد خرچ کیا جائے، کیونکہ ظاہر ہے اول الذکر صورت میں ضرورت زیادہ شدید ہوتی ہے لہٰذا اصل نیکی یہ ہے کہ عین ضرورت کے وقت کام آیا جائے نہ کہ ضرورت پوری ہونے کے بعد، اگرچہ ضرورت کے بعد انفاق کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن اول الذکر صورت میں یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

"اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمان اور زمین کی میراث اللہ کی ہے۔ اے مومنو! فتح سے پہلے جس نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جنگ کی وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا جس نے فتح کے بعد خرچ کیا اور فتح کے بعد جنگ کی، فتح سے پہلے خرچ کرنے والے اور جنگ کرنے والے درجہ میں بہت زیادہ ہیں اور اللہ نے دونوں قسم کے لوگوں سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب اچھی طرح واقف ہے۔" (سورۃ الحدید:۱۰)

مستحقین انفاق

انفاق بدرجہ استحقاق ہونا چاہیے یعنی پہلے والدین اور قریبی عزیز و اقارب کا حق بنتا ہے پھر یتیموں اور مسافروں اور پھر جو بھی ضرورتمند ہو اس کی مدد حسبِ استطاعت کرنی چاہیے، ان کے ساتھ ایسے لوگوں کا بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ جو اپنی سفید پوشی کے بھرم کی وجہ سے مانگ نہیں سکتے لیکن شدید ضرورتمند ہوتے ہیں ایسے لوگ سوال نہیں کرتے لیکن ان کو ان کی ہیبت سے صاف جانا جا سکتا ہے۔

يَسْــَٔـلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

"(یہ) لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ) میں کیا خرچ کریں؟ تو کہہ دیجیے (کہ) جو اچھا مال بھی تم دو اس پر (تمہارے) والدین، قریبی رشتے داروں،

یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے اور جو نیک کام بھی تم کرو اللہ اسے یقیناً اچھی طرح جانتا ہے۔" (سورۃ البقرہ:۲۱۵)

سورۃ البقرہ میں ہی ایک دوسرے مقام پر اس کی صراحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ز يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ج لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

"(یہ خرچ) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں (دوسرے کاموں سے) روکے گئے ہیں وہ زمین میں (آزادی) سے آجا نہیں سکتے بے خبر (شخص ان کے) سوال سے بچنے کے سبب انہیں غنی خیال کرتا ہے تم انہیں ان کی ہیت سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ لپٹ کر سوال نہیں کرتے اور تم جو اچھا مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اللہ اس سے یقیناً واقف ہے۔" (سورۃ البقرہ:۲۷۳)

انفاق کے نتائج

ایسا انفاق جو متذکرہ بالا شرائط کے تابع ہو اس کے نتائج ازروئے قرآن مندرجہ ذیل ہیں۔

الف) اصل رقم کی واپسی کی ضمانت

انسان بظاہر اس بات سے ڈرتا ہے کہ انفاق کی صورت میں اس کی رقم اس کے پاس نہیں رہتی لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ ضمانت دی گئی ہے کہ جو مال بھی اللہ کی راہ میں دیا جائے گا کم از کم اس کی اصل مقدار لازمی طور پر انفاق کرنے والے کو واپس مل جائے گی تاہم یہ وہ کم سے کم صلہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے انفاق کے عوض وعدہ کیا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ط وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

ترجمہ: انہیں راہ پر لانا آپؐ کا ذمہ نہیں ہاں جو چاہے سیدھی راہ اختیار کر لے اور جو اچھا مال بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور حقیقت یہ ہے کہ تم ایسا خرچ صرف اللہ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کرتے ہو سو اس کا نفع بھی تمہارے اپنے نفوس کو ہو گا اور جو اچھا مال بھی تم خرچ کرو وہ تمہیں پورا (پورا واپس) کر دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (سورۃ البقرہ:۲۷۲)

ب) دو گنا تا سات سو گنا سے بھی زائد شرح سے واپسی کی ضمانت

جو مال و دولت انسان اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر مختلف انداز میں بیان کیا ہے اور یہ شرح دو گنی، کئی گنی تا سات سو گنی بلکہ اس سے بھی زائد ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۱﴾

"کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تاکہ وہ اس کو اس سے دو گنا ادا کرے یہ اس کے لیے عزت کا صلہ ہے۔" (سورۃ الحدید:۱۱)

اسی طرح (سورۃ الحدید:۱۸)، (سورۃ البقرہ:۲۶۵) اور (سورۃ التغابن:۱۷) میں بھی دو گنا صلہ دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ایک جگہ سورۃ البقرہ میں کئی گنا زیادہ دینے کا وعدہ کیا گیا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ

"کوئی ہے کہ اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے میں اس کو کئی حصے زیادہ دے۔" (سورۃ البقرہ:۲۴۵)

سورۃ البقرہ میں ہی حق تعالیٰ نے انفاق کے عمل کو ایک ایسے پودے سے تشبیہ دی ہے جس کی سات (۷) بالیاں ہیں اور ہر بالی میں سو (۱۰۰) دانے ہیں:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

"اور جو لوگ اپنے اموال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے اس فعل) کی حالت اس دانہ کی حالت کے مشابہ ہے جو سات بالیاں اگائے (اور) ہر بالی میں

سودانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (اپنے قانون کے مطابق اس سے بھی) بڑھا (کر) دیتا ہے اور اللہ وسعت دینے والا جاننے والا ہے۔"

(سورۃ البقرہ:۲۶۱)

ان آیات کریمہ سے واضح ہے کہ انسان جو بھی مال و دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ کبھی ضائع نہیں جاتی اور اس کا صلہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے جو کم از کم اصل رقم کی واپسی سے لے کر سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں یہ امر ذہن میں رکھیئے کہ اس بھاری شرح واپسی کی ضمانت دینے والا کون ہے؟ کوئی بینک یا حکومت کا ادارہ یا خود حکومت نہیں بلکہ خود قادر مطلق کی ذات ہے جو اختیار کل کی حامل ہے جس کے قبضہ و اختیار میں یہ کل کائنات ہے وہ ضمانت دے رہا ہے۔ غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ کہاں یہ 'سرمایہ کاری' کی جارہی ہے اس کا ضامن کون ہے؟ اور کس 'شرح منافع' سے ادائیگی کی جائے گی؟ کیا آپ یہ 'سرمایہ کاری' کرنا چاہیں گے؟

تاہم اس بحث سے یہ نتیجہ نکال لینا بہر حال درست نہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں محض مالیاتی فوائد کے حصول کے لیے انفاق کیا جانا چاہیے بلکہ اس ضمن میں اصل مقصد تو اللہ کی رضا کا حصول ہے۔

یہ تو انفاق کے وہ نتائج ہیں جنہیں 'مال کے بدلے مال' کے عنوان کے تحت درجہ بند کیا جا سکتا ہے، تاہم یہ نتائج صرف یہیں تک محدود نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا پسندیدہ عمل ہے جس کے مزید کئی مثبت اور تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں جن کی قرآن مجید میں مختلف مقامات پر وضاحت کی گئی ہے، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

الف) کبھی نہ ختم ہونے والی تجارت

قرآن مجید انفاق کو ایک ایسی تجارت کے مثل قرار دیتا ہے جو کبھی تباہ نہیں ہو گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾

"جو لوگ اللہ کی کتاب کی اطاعت کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہی درحقیقت ایک

ایسی تجارت کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں جو کبھی تباہ نہیں ہو گی۔" (سورۃ فاطر:۲۹)

ب) اللہ کی قربت اور رحمت کا ذریعہ ہے

سورۃ التوبہ میں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان اور انفاق کو اللہ کی قربت اور رحمت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

"اور اہلِ عرب میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے خدا کی قربت اور رسول کی طرف سے تحسین و آفرین کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ فعل ان کے لیے ضرور (اللہ کی) قربت کا ذریعہ ہو گا، اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا، بے شک وہ غفور رحیم ہے۔" (سورۃ التوبہ:۹۹)

ج) اعلیٰ، معزز اور بزرگ تر بدلہ

انفاق ایک ایسا مبارک اور بہترین عمل ہے جس کے بدلے میں خود اللہ تعالیٰ نے ایک اعلیٰ، معزز اور بزرگ تر بدلے کا وعدہ کیا ہے اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، یہ تصور بھی ناممکن ہے۔

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

"اور اللہ کی راہ میں چھوٹا سا خرچ بھی نہیں کرتے نہ بڑا یا کوئی میدان طے کرتے ہیں مگر (ان کے اعمال صالحہ) میں لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کا اعلیٰ بدلہ دے۔" (سورۃ التوبہ:۱۲۱)

اسی طرح سورۃ الحدید میں اللہ کو دیئے جانے والے قرض کے بدلے میں معزز بدلے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۱﴾

"کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تاکہ وہ اس کو اس سے دوگنا ادا کردے یہ اس کے لیے ایک معزز بدلہ ہے۔" (سورۃ الحدید:۱۱)

اسی طرح سورۃ المزمل میں نماز، زکوٰۃ اور انفاق کے بدلے میں بہتر نتائج اور زیادہ اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

"اور نماز قائم کیا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ کو قرض دیتے رہو اور جو نیک عمل تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اس کو اللہ کے پاس بہتر اور صلے میں بزرگ تر پاؤ گے اور خدا سے استغفار کرتے رہو بے شک اللہ غفور اور رحیم ہے۔" (سورۃ المزمل:۲۰)

یہ ایک ایسا فعل ہے جس کا مثبت نتیجہ لازمی طور پر سامنے آتا ہے اور اس بہترین نتیجے کی ذمے داری خود قادر مطلق نے لی ہے جو یقیناً نتائج پیدا کرنے والوں میں سب سے بہترین نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

"اور آپ کہہ دیجیے کہ میرے بندوں میں سے جو چاہے (اللہ کے قانون کے مطابق) اپنے رزق کو وسیع کرلے اور جو چاہے تنگ کرلے اور جو کچھ بھی تم خرچ کروگے اللہ اس کا نتیجہ ضرور نکالے گا اور وہ کامل ترین رزق دینے والا ہے۔"

(سورۃ السبا:۳۹)

د) خوف اور حزن سے تحفظ

انفاق ایک ایسا بابرکت عمل ہے جو انسان کو خوف اور مایوسی سے دور رکھتا ہے بشرطیکہ احسان جتلا کر اسے ضائع نہ کردیا جائے۔

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتۡبِعُوۡنَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًی ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۶۲﴾

"جو لوگ اپنے اموال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ کسی رنگ میں احسان جتاتے ہیں اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں ان کے رب کے پاس ان (کے اعمال) کا بدلہ (محفوظ) ہے اور نہ تو انہیں کسی قسم کا خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں گے۔" (سورۃ البقرہ:۲۶۲)

یہی مضمون (سورۃ البقرہ:۲۷۴) میں بھی دہرایا گیا ہے۔

ر) اپنے آپ کو ظلم اور ہلاکت سے بچانے کے لیے

قرآن مجید کی رو سے انفاق ایک ایسی تقدیر ہے جس کو اپنانے والے اپنے آپ کو ہلاکت سے محفوظ رکھتے ہیں، یہی راہ ظلم سے بچنے کی راہ بھی ہے۔

وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّهۡلُکَةِ ۚۖ وَاَحۡسِنُوۡا ۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۹۵﴾

"اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو اور احسان سے کام لو (اور) اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (سورۃ البقرہ:۱۹۵)

اس راہ سے انکار کرنے والے ظالم ہیں اور ظلم خواہ کوئی ہو اس کی ہر شکل ناپسندیدہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡکٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۵۴﴾

"اے اہل ایمان! جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے اس دن کے آنے سے پہلے کہ جس میں نہ کسی قسم کی بیع نہ دوستی اور نہ شفاعت ہو گی (اللہ کی راہ میں) خرچ کر لو اور انکار کرنے والے ظالمین ہیں۔" (سورۃ البقرہ:۲۵۴)

س) کامل نیکی کے حصول کے لیے

کامل نیکی کا حصول انفاق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

"تم کامل نیکی کو ہرگز نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ اشیاء میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے اللہ اسے یقیناً خوب جانتا ہے۔" (سورۃ آل عمران:۹۲)

ش) زندگی کی ناہمواریاں دور کرنے کے لیے

اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید و نصرت کے حصول کے لیے بنی اسرائیل کو جن شرائط کا پابند کیا تھا ان میں سے ایک شرط انفاق فی سبیل اللہ بھی تھی، اس کے نتیجے میں ان سے اللہ کا وعدہ تھا کہ اگر وہ دیگر منجملہ شرائط کے ساتھ انفاق کرتے رہیں گے تو اللہ ان کی زندگیوں کی ناہمواریاں دور کردے گا اور انہیں بہترین نتائج سے سرفراز کرے گا۔ ظاہر ہے یہ امر صرف بنی اسرائیل سے ہی مخصوص نہ تھا، اللہ تعالیٰ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی جو اصول کل تھا وہی آج بھی ہے اور کل بھی وہی رہے گا۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۲﴾

"اور ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار کھڑے کیے تھے اور (ان سے) کہا تھا (کہ) اگر تم نماز پڑھو گے اور زکوٰۃ دو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی ہر طرح سے مدد کرو گے اور (اللہ کو) قرض حسنہ دو گے تو میں یقیناً تمہاری زندگی کی ناہمواریاں دور کردوں گا اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے اندر نہریں بہتی ہوں گی مگر جو (شخص) تم میں سے اس کے بعد بھی انکار سے کام لے تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا ہے۔" (سورۃ المائدہ:۱۲)

ک) نفس کے لیے بہتر ہے

انفاق کا طرز عمل خود نفس انسانی کے لیے بہتر ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝١٦

"پس جتنا ہو سکے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی اطاعت کرو اور اپنا مال اس کی راہ میں خرچ کرتے رہو یہ تمہارے نفوس کے لیے بہتر ہو گا اور جو لوگ دل کے بخل سے بچائے جاتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔" (سورۃ التغابن:۱۶)

ل) اللہ کی رضا کے حصول اور بامراد ہونے کے لیے

اس شخص کی خوش قسمتی کا کیا کہنا جسے اللہ کی رضا حاصل ہو گئی ہو ایسا شخص ہی بامراد ہوتا ہے اس منزل کے حصول کی راہ بھی انفاق ہی ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۗ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٣٨

"پس چاہیے کہ قریبی رشتہ دار، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو! یہ بات بہت بہتر ہے ان لوگوں کو لیے جو اللہ کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہیں وہی بامراد ہونے والے ہیں۔"

(سورۃ الروم:۳۸)

سورۃ الدھر میں ایسے افراد کو جو مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں ان کے متعلق اللہ کا فرمان ہے کہ وہ (اللہ) ضرور انہیں قیامت کے ضرر سے بچالے گا اور انہیں خوشی بخشے گا (سورۃ الدھر:۸۔۱۱) یہی وہ لوگ ہیں جن کا مقصود اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے اور انہی سے ان کا رب راضی ہوتا ہے، یہ لوگ یقیناً بامراد ہیں۔

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝١٨ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝١٩ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝٢٠ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝٢١

"جو اپنا مال تزکیہ کے لیے دیتا ہے اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہوتا جس کا بدلہ اتارنے کا اس کو خیال ہو مگر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنا (اس کا مقصد

ہوتا ہے) اور وہ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا۔" (سورۃ اللیل:۱۸۔۲۱)

م) انفاق سے راہ آسان ہو جاتی ہے

انفاق کے عمل کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اللہ اس عمل کے کرنے والے کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰىۙ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰىۙ۝۶ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى۝۷

"پس جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور نیک بات کی تصدیق کی اسے ہم ضرور آسانی بہم پہنچائیں گے۔" (سورۃ اللیل:۷-۵)

ر) عاقبت کا بہترین گھر

ایسے لوگ جو دور ابتلا میں صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو اللہ نے دیا ہے اس میں سے ظاہر اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں بہترین گھر ہے۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِۙ۝۲۲

"اور جو رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (مصائب میں) صبر کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور جو (مال) ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں اور نیکی سے بُرائی کو دور کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لیے عاقبت کا (بہترین) گھر ہے۔" (سورۃ الرّعد:۲۲)

ک) دردناک عذاب سے بچنے کے لیے

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور جہاد کے ساتھ انفاق کو ایک ایسی تجارت سے تشبیہ دی گئی ہے جو دردناک عذاب سے محفوظ رکھتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَۙ۝۱۱

"اے اہل ایمان! کیا تمہیں ایک ایسی تجارت کی خبر دوں جو تم کو دردناک عذاب سے بچائے گی (اور وہ تجارت یہ ہے کہ) تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اللہ کے راستے میں اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کرو! اگر تم علم رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔" (سورۃ الصّف:۱۱-۱۰)

ی) اپنے وجود کی بقا کے لیے

انفاق کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایسی قوم جو انفاق نہیں کرتی اللہ کا قانون اسے زندگی کے حق سے ہی محروم کر دیتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لے آتا ہے جو انفاق میں پچھلی قوم کی طرح سست نہیں ہوتی۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ؀

"سنو! تم وہ لوگ ہو جن کو اس لیے بلایا جاتا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور تم میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو بخل سے کام لیتے ہیں اور جو بھی بخل سے کام لے وہ اپنے نفس ہی کے متعلق بخل سے کام لیتا ہے ورنہ اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو اور اگر تم پھر جاؤ تو وہ تمہاری جگہ ایک اور قوم کو بدل کر لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔" (سورۃ محمد:۳۸)

یے) اوپر والا ہاتھ بہتر ہے

ایک مشہور حدیث ہے کہ "اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اوپر والا ہاتھ دینے والا اور نیچے والا ہاتھ لینے والا ہے۔" ظاہر ہے ایک ایسا شخص جو انفاق کرتا ہے اور جو انفاق نہیں کرتا قرآن مجید کی نظر میں دونوں برابر نہیں ہیں، اول الذکر بہر حال ثانی الذکر سے بہتر ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؀

"اللہ ایک ایسے بندے کی حالت بیان کرتا ہے جو غلام ہو اور (اس کے مقابلے میں اس بندے کی حالت بھی) جسے ہم نے اپنے پاس سے اچھا رزق دیا ہو اور اس میں سے پوشیدہ طور پر (بھی) اور اعلانیہ (بھی) ہماری (راہ میں) خرچ کرتا ہو کیا وہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ (ہرگز نہیں) ہر تعریف کا اللہ ہی مستحق ہے لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔" (سورۃ النحل:۷۵)

یہ ہیں وہ نتائج جو انفاق کے نتیجے میں مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں انہی نتائج کی وجہ سے یہ عمل غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ازروئے قرآن اس تیسرے قانون کی رو سے معزز رزق کا انحصار اللہ سے ڈرنے، اُسی پر توکل کرنے، اور انفاق پر ہوتا ہے۔

چوتھا قانون: مہاجروں، مہاجرین کو پناہ دینے والوں، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور شہداء کے لیے معزز رزق ہے

مشیت ایزدی کے اس قانون کی رو سے چار قسم کے افراد: اوّل جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنا وطن چھوڑا اور ہجرت کی، دوم وہ لوگ جنہوں نے ان کو پناہ دی، سوم جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور چہارم وہ لوگ جو راہ خدا میں شہادت کے درجہ عظیم پر فائز ہوئے، ان سب کے لیے معزز رزق ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ

"اور جو لوگ ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور اللہ کی راہ میں لڑتے رہے اور جنہوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کے لیے مغفرت اور معزز رزق ہے۔" (سورۃ الانفال:۷۴)

ایک دوسری جگہ راہ حق کے شہداء کے لیے بھی 'احسن رزق' (اچھا، عمدہ اور اعلیٰ رزق) کی فراہمی کی ضمانت دی گئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ

وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾

"اور جن لوگوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی پھر مارے گئے یا مر گئے ان کو خدا اچھی روزی دے گا اور بے شک اللہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔"

(سورۃ الحج:۵۸)

پانچواں قانون: اللہ کے مخلص بندوں کے لیے رزق معلوم

مشیت ایزدی سے متعین کردہ اس قانون کے مطابق مصلحین کے لیے رزق معلوم ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾

"مگر جو اللہ کے مخلص بندے ہیں یہی (وہ) لوگ ہیں جن کے لیے رزق معلوم ہے۔" (سورۃ الصّٰفّٰت:۴۰۔۴۱)

مخلص کا مادہ خ، ل، ص ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں کھوٹ اور میل سے الگ ہو کر صاف اور خالص ہو جانا، بالفاظ دیگر ایسے افراد جو لوگوں کی عام روش سے ہٹ کر صحیح راہ پر چل رہے ہوں انہیں مخلص کہا جائے گا۔ اس لیے مخلص اسے کہتے ہیں جسے دوسروں سے الگ کر کے کسی خاص کام کے لیے چُن لیا جائے یا مختص کر دیا جائے۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

"بے شک وہ (یوسفؑ) ہمارے خاص بندوں میں سے تھے۔"

(سورۃ الیوسف:۲۴)

بالفاظ دیگر وہ عام لوگوں کی راہ پر نہیں چلتے تھے اللہ کی راہ پر چلتے تھے اسی بنیاد پر تمام انبیاء اسی مبارک گروہ کے افراد ہیں، یہی وجہ ہے کہ سورۃ ص میں انبیاء کرام کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ

"ہم نے انہیں عام لوگوں سے ہٹا کر (ایک خاص گروہ بنا دیا)" (سورۃ ص:۴۶)

اس قانون کی رو سے اللہ کے مخلص بندوں کے لیے معزز اور پاکیزہ رزق ہے۔

چھٹا قانون: پاک لوگوں کے لیے رزق کریم

مشیت الٰہی سے طے شدہ اس قانون کی رو سے پاک لوگ بھی معزز رزق کے حقدار ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ارشاد ربانی ہے:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ أُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۖ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٦﴾

"ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لیے اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے یہ (پاک لوگ) ان (بدگویوں) کی باتوں سے بری ہیں (اور) ان کے لیے بخشش اور معزز رزق ہے۔" (سورۃ النور: ۲۶)

ساتواں قانون: صبر کا نتیجہ، آسان رزق

ایسے افراد اور قومیں جو آزمائش کی گھڑی میں ثابت قدم رہتی ہیں اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتی ہیں ان کے اس فعل کے بدلے اللہ انہیں آسان رزق عطا فرماتا ہے۔ اس کی مثال بنی اسرائیل کے حوالے سے دی جا سکتی ہے۔ قوم فرعون نے ان کو غلام بنا رکھا تھا اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے۔ ان مظالم پر انہوں نے صبر کیا اور اس صبر کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں مختلف انواع و اقسام کی نعمتوں سے نوازا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿١٣٧﴾

"اور جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے ان کو زمین کے مشرق و مغرب کا جس میں ہم نے برکت دی تھی وارث کر دیا اور بنی اسرائیل نے (فرعون کے مظالم پر) صبر کیا اس لیے آپ کے رب کا نیک وعدہ (جو اس نے بنی اسرائیل سے کیا تھا) ان کے حق میں پورا ہوا اور فرعون اور قوم فرعون جو (محل) بناتے اور (انگور کے باغ) جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو ہم نے تباہ کر دیا۔" (سورۃ الاعراف: ۱۳۷)

بنی اسرائیل کے اس صبر کی وجہ سے انہیں جو نعمتیں ملیں ان پاکیزہ چیزوں میں رزق بھی شامل تھا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶ۚ

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (ہدایت) اور حکومت اور نبوت بخشی اور پاکیز چیزوں میں سے رزق دیا اور اہل عالم پر فضیلت بخشی۔" (سورۃ الجاثیہ:۱۶)

آٹھواں قانون: رزق کا شکر لازم ہے

ازروئے قرآن کشادگی رزق کے لیے اللہ کی جانب سے عطا ہونے والے رزق کا شکر لازم ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝۱۵۲ۧ

"سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔" (سورۃ البقرہ:۱۵۲)

شکر، قرآن مجید کی ایک بہت جامع اصطلاح ہے، اس کا مادہ ش، ک، ر ہے۔ اس کے اصل معنی بھر جانا اور اظہار کرنا کے ہیں، اس کے علاوہ مقدار میں کثیر ہونا بھی اس میں شامل ہے۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک انسان کی طرف سے شکر کے معنی اطاعت اور ادائے فرض، نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار اور خدا کی طرف سے شکر کے معنی پورا پورا بدلہ دینا یا تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ہے۔

شکر کا مفہوم

جہاں تک شکر کے قرآنی مفہوم کا تعلق ہے اس سے مراد اعمال صالحہ ہیں یعنی اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہوئے ایسے افعال جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ

رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚؕ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۵﴾

"اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے ہی جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے یہاں تک کہ جب خوب جوان ہو جاتا اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے رب! مجھے توفیق دے تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں ان کا شکر گذار رہوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں اصلاح (و تقویٰ) دے اور میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں ہوں۔" (سورۃ الاحقاف:۱۵)

اس کی مزید وضاحت سورۃ النمل کی مندرجہ ذیل آیت میں کر دی گئی:

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾

"تو وہ اس کی بات پر مسکرائے اور کہنے لگے کہ اے میرے رب! مجھے توفیق عنایت کر کہ جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں میں ان کا شکر ادا کروں اور ایسے نیک اعمال کروں جنہیں تو پسند کرے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں شمار فرما۔" (سورۃ النمل:۱۹)

متذکرہ بالا دونوں آیات (سورۃ الاحقاف:۱۵) اور (سورۃ النمل:۱۹) میں شکر سے مراد اعمال صالحہ ہیں یعنی ایسے اعمال جن کی انجام دہی سے اللہ کی رضا حاصل ہو، بالفاظ دیگر راہ مستقیم اختیار کرنا شکر ہے۔

اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾

"اسے راستہ بھی دکھا دیا (اب وہ) خواہ شکر گذار ہو یا ناشکرا۔" (سورۃ الدھر:۳)

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ صحیح راہ کا انتخاب باالفاظ دیگر تقویٰ کی راہ کا انتخاب اور اس پر دل جمعی سے چلنا بھی شکر ہے۔

نواں قانون: استغفار سے رزق

ازروئے قرآن اگر کوئی فرد یا قوم غلط روش پر چلنا شروع ہو جائے تو لامحالہ اس کے منفی نتائج اس پر پڑنا شروع ہو جاتے ہیں لیکن اس سے قبل کہ یہ منفی اثرات اس فرد یا قوم کی ہلاکت پر منتج ہو جائیں وہ فرد یا قوم اجتماعی طور پر اس غلط راہ سے رجوع کر لے اور راہ ہدایت پر آجائے تو اس کے نتیجے میں ایک طرف تو انہیں ان کی سابقہ غلط روش کے اثرات سے تحفظ مل جاتا ہے دوم صحیح راہ اختیار کرنے کے مثبت اثرات بھی پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی مشیت سے طے کردہ اس قانون کے مطابق اگر کوئی قوم ایک خاص مرحلے تک رجوع کر لیتی ہے باالفاظ دیگر سابقہ راہ سے تائب ہو کر راہ ہدایت اختیار کر لیتی ہے تو اس پر رزق کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس کی تصدیق سورۃ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کے ان کلمات سے ہو جاتی ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۭ﴿۱۲﴾ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ۚ

"اور کہا اپنے رب سے استغفار کرو وہ بڑا معاف کرنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے مینہ برسائے گا اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں باغ عطا کرے گا ان میں تمہارے لیے نہریں بہادے گا۔ تم کو کیا ہوا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے طالب نہیں ہوتے۔" (سورۃ النوح: ۱۰۔۱۳)

یہ آیات واضح طور پر اس امر پر دلیل ہیں کہ کوئی قوم جو غلط راہوں کی مسافر ہو اگر اپنے سابقہ عمل سے رجوع کر لے تو اللہ بار بار توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اور اگر وہ قوم اپنے عمل سے ثابت بھی کر دے کہ واقعی اس نے راہ ہدایت اختیار کر لی ہے تو اللہ اپنی رحمتوں کے دروازے اس قوم پر کھول دیتا ہے۔ لہذا اس بنیاد پر کسی بھی قوم کے لیے کسی بھی وقت (لمحۂ

اجل سے پہلے) رجوع کا موقعہ ہوتا ہے اور اگر وہ اس سے فائدہ اٹھالے تو اس پر رزق کی راہیں کشادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہی صورت حال انفرادی طور پر بھی ہوتی ہے۔

متذکرہ بالا قوانین وہ ہیں جن پر عمل درآمد کے نتیجے میں رزق کی کشاد لازمی ہے کیونکہ یہ خدائے برحق کے قوانین ہیں جو فلاح کی جانب لے جانے والی واحد راہ ہے۔

بغیر کسی حساب کے رزق

اگر متذکرہ بالا قوانین کی کامل اطاعت کی جائے تو ایک مرحلہ وہ بھی آتا ہے جسے قرآن مجید میں بغیر کسی حساب کے رزق عطا ہونے کا مرحلہ کہا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

"بے شک اللہ (اپنے قوانین مشیت سے مشروط) جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔" (سورۃ آل عمران:۳۷)

اس اصطلاح کا استعمال (سورۃ النور:۳۸)،(سورۃ المومن:۴۰) میں بھی کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح خالصتاً رزق کے حوالے سے ہی قرآن مجید میں استعمال نہیں کی گئی ہے بلکہ لوگوں کے اعمال کی جزا کے حوالے سے بھی اس کا قرآن مجید میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾

"جو صبر کرنے والے ہیں انہیں بے حساب اجر ملے گا۔" (سورۃ الزمر:۱۰)

اس اصطلاح کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ خدا بغیر کسی قاعدے، قانون یا حساب کتاب کے اجر یا رزق عطا کر دیتا ہے۔ یہ تصور پوری قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ جب ہر ہر شے قواعد و ضوابط کی ایک مخصوص زنجیر میں بندھی ہوئی ہے تو ظاہر ہے ان مقامات پر استثنیٰ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ رزق کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ متذکرہ بالا قوانین کی اطاعت کے نتیجے میں ایک خاص مرحلہ وہ آتا ہے جہاں رزق کی مقدار غیر معمولی وسیع یا لامحدودیت کو چھونے لگتی ہے۔ اس کی ایک ادنیٰ سی مثال صرف تصور کی وضاحت کے لیے بوفے کی دی جا سکتی ہے۔ بوفے میں ایک خاص رقم کی ادائیگی کے بعد جو یقیناً عام کھانے کی رقم سے زیادہ ہوتی ہے صارف کو ہر قسم کے کھانوں، سویٹ ڈشز اور تمام دستیاب مشروبات

وغیرہ کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ کھانے یقیناً اتنے ہوتے ہیں جو انسان کی نارمل بھوک کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں باالفاظ دیگر ایک مخصوص رقم کی ادائیگی سے بہت بڑی مقدار میں رزق دستیاب ہو جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہی وہ مرحلہ ہے جسے بغیر کسی حساب کے رزق سے تعبیر کیا گیا ہے، اسے اطاعت کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے جہاں رزق کی مقدار عام انسانی اندازوں سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔

رزق کی بست کے قوانین

جہاں تک ان قوانین کا تعلق جن کے تحت انسانوں کا رزق کم یا محدود ہو جاتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلا قانون: اللہ کے قوانین سے اعراض سے معیشت تنگ ہو جاتی ہے

جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف قرآن مجید میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ جو شخص بھی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم جب بھی، کہیں بھی ان اصولوں سے انحراف کرے گا تو اس کے نتیجے میں اس کی معیشت محدود ہو جائے گی۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

"اور جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی اور (روزِ) قیامت اسے ہم اندھا کر کے اٹھائیں گے۔" (سورۃ طٰہٰ:۱۲۴)

اس آیت کریمہ میں مختلف الفاظ پر تدبر ضروری ہے جن میں اعرض، ذکر، معیشۃ اور ضنکا شامل ہیں۔ ان الفاظ کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

اعرض کا مادہ ع، ر، ض ہے۔ اس کے معنی کسی شے کا ظاہر ہونا، کسی کے سامنے کسی شے کو پیش کرنا، نظر آنا، سامنے آنا کے ہیں، اس کے علاوہ کسی شے کی چوڑائی اور وسعت کے ساتھ ساتھ، اعراض کرنا، پیٹھ موڑ لینا، آڑ، گھر کا ساز و سامان اور مال و دولت، قریبی منفعت کی حامل شے یا اشیاء کے ساتھ روگردانی کرنا، ہٹ جانا، انحراف کرنا، ایک طرف ہو جانا، گریز کرنا کے بھی ہیں۔ یہاں اس کے آخری الذکر معنی مراد ہیں۔

ذ کر کا مادہ ذ، ک، ر ہے۔ اس کے معنی کسی شے کو محفوظ کر لینے، یاد رکھنے، ذہن میں رکھنے، دل میں حاضر کر لینے کے ہیں۔ یہ نسیان / بھول جانے کی ضد ہے۔ التذکرہ سے مراد کسی ضرورت کو یاد دلانا ہے، شہرت کو بھی ذکر کہا جاتا ہے اس کے علاوہ کسی کے متعلق اچھی بات کہنے کو عزت اور مشرف، عبرت و موعظت کے ساتھ اس کتاب کو بھی ذکر کہا جاتا ہے جس میں دین کے اصول و قوانین اور تفصیلات درج ہوں، اسی سے مذکر ہے یعنی مرد جو مؤنث کی ضد ہے۔

قرآن مجید میں خود اس کتاب کو ذکر کہا گیا ہے۔ (سورۃ النحل: ۴۴) اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر ہر قسم کے اصول و قوانین، امثال اور ان کی تفصیلات بیان کر دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مختلف آیات (احکام و قوانین، مظاہر فطرت) کو ذکر اللہ کہا گیا ہے۔ (سورۃ الزمر: ۲۱) سورۃ البقرہ میں ان قوانین کے حوالے سے کہا گیا کہ تم ان کی اطاعت کرو میں تمہاری حفاظت کروں گا (سورۃ البقرہ: ۱۵۲)، اللہ کے یہی قوانین ہیں جن کے متعلق کہا گیا کہ ان کی اطاعت سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے (سورۃ الرعد: ۲۸) متذکرہ بالا آیت کے حوالے سے ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کے قوانین ہوں گے جو قرآن مجید میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

معیشۃ کا مادہ ع، ی، ش ہے۔ اس کے معنی کھانے پینے کی ان تمام چیزوں کے ہیں جو زندگی گذارنے کے لیے ضروری ہیں یا سامان زیست۔

ضنکا اس کا مادہ ض، ن، ک ہے۔ اس کے معنی تنگی کے ہیں یہ کشادگی کی ضد ہے، اس کے معنی کمزوری، اضمحلال، لاغر اور ضعیف کے بھی ہیں۔

اس بنیاد پر اب اگر متذکرہ بالا آیت (سورۃ طٰہٰ: ۱۲۴) کا تجزیہ کیا جائے تو بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص بھی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم جب قرآن مجید میں بیان کیئے گئے احکامات سے انحراف یا روگردانی کرے گا یا ان سے پیٹھ موڑے گا تو اس کا لازمی نتیجہ رزق / مال و دولت / سامان زیست کی تنگی کی شکل میں سامنے آئے گا، یہ کلیہ ظاہر ہے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر ہمیشہ سے یکساں تھا، ہے اور تاقیامت رہے گا۔

دوسرا قانون: ناشکری سے رزق تنگ ہو جاتا ہے

شکر سے مراد جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا اعمال صالحہ ہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ کی عطا کردہ نعمت یا نعمتوں کو اس طرح استعمال میں لانا کہ وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے

باعث منفعت ہوں، شکر کہلاتا ہے۔ ناشکری اس کا برعکس عمل ہے یعنی اللہ کی جانب سے عطا ہونے والی نعمت یا نعمتوں کو صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے روک لینا اور کسی دوسرے کو اس سے فائدہ نہ پہنچنے دینا۔ کسی بھی فرد یا قوم کا اس کو ملنے والی نعمت / نعمتوں کے بارے میں یہ طرز عمل ناشکری کہلاتا ہے اور ناشکری رزق کی تنگی کے بنیادی اسباب میں سے ایک ہے جس کے نتیجے میں بھوک اور خوف عذاب کی صورت میں مسلط ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک بدیہی قانون ہے جس سے انحراف ممکن نہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ ہر طرح امن چین سے تھی، ہر طرف سے رزق بافراغت چلا آتا تھا مگر ان لوگوں نے خدا کی نعمت کی ناشکری کی تو خدا نے ان کو ان کے اعمال کے سبب بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا اور ان کے پاس انہی میں سے ایک پیغمبر آیا تو انہوں نے اس کو جھٹلایا سو ان کو عذاب نے آن پکڑا اور وہ ظالم تھے۔" (سورۃ النحل: ۱۱۲۔۱۱۳)

ان دونوں آیات ربانی میں متعدد نکات پر تدبر لازمی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ایک عمومی کلیہ
۲۔ خدا کی ناشکر گذاری
۳۔ بھوک اور خوف کا لباس
۴۔ اپنے اعمال کے سبب تباہی
۵۔ رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں عذاب
۶۔ تباہی کا بنیادی سبب: ظلم

ان نکات کی انفرادی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ ایک عمومی کلیہ

ان آیات میں سب سے پہلا نکتہ جو بنیادی اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ آیات مذکور

میں کسی خاص بستی یا انسانوں کے گروہ کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک عمومی بستی کی بابت بیان ہے لہذا اس بستی کے حوالے سے جو کلیہ یا کلیات مستنبط ہوں گے وہ ایک عمومی حیثیت رکھیں گے اور بلالحاظ وقت اور مقام جو صورتحال اس آیت میں بیان کی گئی ہے اس جیسی کسی بھی دیگر صورت میں قابل اطلاق ہوں گے۔

۲- خدا کی ناشکر گزاری

آیات کی رو سے یہ ایک ایسی بستی تھی جو بے خوف اور مطمئن تھی اور جہاں رزق کی فراوانی تھی مگر انہوں نے اللہ کی نعمت کی ناشکری کی یا با الفاظ دیگر کفران نعمت کیا۔

۳- بھوک اور خوف کا لباس

متذکرہ بالا آیات اس امر پر شاہد ہیں کہ مشیت الٰہی کے طے شدہ قانون کے مطابق جو بستی بھی اس کی نعمتوں کا کفران کرے گی اسے بھوک اور خوف کا لباس پہننا ہو گا، یہاں اس امر کی صراحت لازمی ہے کہ بھوک اور خوف کے لباس سے کیا مراد ہے؟

جوع کا لفظ قرآن مجید میں بھوک کے لیے آیا ہے (سورۃ البقرہ:۱۵۵) از روئے قرآن رزق کی فراوانی اللہ کی نعمت ہے اور رزق کی تنگدستی اس کا عذاب ہے، لہذا ایسی قومیں جو رزق کے لیے دوسروں کی محتاج ہوں وہ عذاب الٰہی کا شکار ہوتی ہیں۔

۴- اپنے اعمال کے سبب تباہی

متذکرہ بالا تباہی جو چاہے بھوک اور خوف کی شکل میں ہو یا کسی بھی دیگر شکل میں جو (ناشکروں کا لازمی مقدر ہوتی ہے) کسی خارجی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ خود ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اپنی تباہی کو خود دعوت دیتا ہے۔ یہ انسان کے اپنے منفی اعمال ہوتے ہیں جو عذاب کی صورت میں اس پر مسلط ہو جاتے ہیں، اس میں کسی کا کوئی دوش نہیں ہوتا۔ ناشکرے اگر بھوک اور خوف کا شکار ہوتے ہیں تو اس کی وجہ ان کا اپنا ناشکرا پن ہوتا ہے جو ان کی تباہی کا سبب ہوتا ہے۔

۵- رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں عذاب

متذکرہ بالا آیات (سورۃ النحل:۱۱۲-۱۱۳) پر تدبر کرنے سے یہ حقیقت بھی سامنے

آتی ہے کہ اگر صرف ناشکری کی جائے تو خوف اور بھوک کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے لیکن جب اصلاح احوال کے لیے اللہ کی جانب سے پیغمبر بھیجے جائیں اور ان بستیوں میں رہنے والے جو پہلے ہی بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا تھے انہوں نے جب اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو ان کی تباہی پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی کیونکہ انہوں نے راہ ہدایت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا وہ مکمل طور پر تباہ اور برباد ہو گئے اور اللہ نے ان کو نسیاً منسیاً کر دیا، اس تمام عمل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ ظالم تھے۔

٦- تباہی کا بنیادی سبب: ظلم

ظلم کے بنیادی معنی کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا، حد سے تجاوز کرنا، کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا کے ہیں، یہ تبدیلی مقام یا وقت یا کسی بھی دیگر شکل میں ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید میں ظالمین کا لفظ بکثرت آیا ہے اور بالعموم قانون شکنی، حدود فراموشی، ناجائز تصرف، واجبات کی پوری پوری ادائیگی نہ کرنا، حدود فراموشی وغیرہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ بنیادی نکتہ بہر حال حدود فراموشی ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کے احکامات کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کی متعین کردہ حدود سے باہر نکل جاتے ہیں وہ ظالم ہیں، ناشکرا اپنی ظلم ہے اور ظلم کا انجام محض تباہی ہے۔ اس حوالے سے ایک بنیادی کلیہ قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾

"نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔" (سورۃ البقرہ:۲۷۹)

تیسرا قانون: معیشت کی افراط سے متکبر بستیاں تباہ کر دی جاتی ہیں

مشیت الٰہی سے طے شدہ اس قانون کے تحت معیشت کی افراط سے متکبر ہو جانے والی بستیاں تباہ کر دی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے ارشاد ربانی ہے:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٥٨﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا

ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾

"اور ہم نے بہت سی وہ بستیاں تباہ کر دیں جو اپنے عیش و عشرت میں اترانے لگیں تھیں۔ یہ ہیں ان کی رہائش کی جگہیں جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد کی گئیں اور ہم ہی ہیں آخر میں تمام چیزوں کے وارث، تیرا رب کسی بستی کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان کی کسی بڑی بستی میں اپنا کوئی پیغمبر نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات پڑھ کر سنا دے اور ہم بستیوں کو اسی وقت ہلاک کرتے ہیں جبکہ وہاں کے رہنے والے ظلم و ستم پر کمر کس لیں اور تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے وہ صرف دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی رونق ہے ہاں اللہ کے پاس جو ہے وہ بہت بہتر اور دیرپا ہے کیا تم نہیں سمجھتے؟" (سورۃ القصص:۵۸۔۶۰)

چوتھا قانون: بخل سے معیشت تنگ ہو جاتی ہے

بخل سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی چیزوں کو ایسی جگہوں پر روک لے جہاں انہیں روکنا نہیں چاہیے، اس کی دو صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ انسان خود ایسا کرے اور دوسرے یہ کہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کا حکم دے۔ اسی حوالے سے شح اس جذبے کو کہتے ہیں جس کے تحت انسان ایسا کرتا ہے یعنی شح میں حرص اور بخل دونوں جذبے شامل ہو جاتے ہیں۔

بخل، انفاق کی ضد ہے۔ انفاق سے مراد ہے اپنی ضرورت سے زائد ہر چیز کو اللہ کی راہ میں کھلا رکھنا جبکہ بخل کے تحت انسان ضرورت کے تحت بھی اپنی زائد از ضرورت اشیاء (مال و دولت) دوسروں کو نہیں دینا چاہے دوسرا کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو اور خود انسان کے پاس کتنا ہی زائد از ضرورت مال و دولت کیوں نہ ہو۔ بخل کرنے والا، بخیل کہلاتا ہے۔ بخل ایک سخت ناپسندیدہ فعل ہے اور قرآن مجید میں کم از کم بارہ (۱۲) مقامات پر اس فعل کی مذمت کی گئی ہے اور اس کا بھیانک انجام بتایا گیا ہے۔

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۭ﴿۱۰﴾ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ﴿۱۱﴾

"اور جس نے بخیلی کی اور لاپرواہی برتی اور نیک بات کی تکذیب کی تو ہم بھی اس کے لیے تنگی اور مشکل کا سامان میسر کر دیں گے، اس کا مال اسے (اوندھا) گرنے کے وقت کچھ کام نہیں آئے گا۔" (سورۃ الیل:۸۔۱۱)

ان آیات کریمہ کی رو سے تین افعال یعنی بخل، لاپرواہی اور نیک باتوں کی تکذیب کے نتائج کو بیان کیا گیا ہے جو تنگی اور مشکلات کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

پانچواں قانون: حبِ مال میں تباہی ہے

قرآنی نقطۂ نگاہ سے مال کا حصول کوئی ناپسندیدہ شے نہیں ہے بلکہ ایک اچھے معیارِ زندگی کے حصول کے لیے جدوجہد کی جانی چاہیے۔ تاہم اصل غلطی وہاں سے شروع ہوتی ہے جب انسان مال کو زادِ سفر سمجھنے کی بجائے منزل سمجھ لیتا ہے اور اسی کو منتہاو مقصود جان کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتا ہے بلکہ ان سے غافل ہو جاتا ہے، یہ گمراہی ہے اور ہر طرح کی گمراہی کی طرح اس کا انجام بھی محض تباہی ہے۔

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۴ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝۵ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝۷ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝۸

"زیادتی کی خواہش نے تمہیں غافل کر دیا ہے یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں، ہرگز نہیں تم عنقریب معلوم کر لو گے ہرگز نہیں پھر تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا دیکھو اگر تم جانتے یعنی علم الیقین (رکھتے تو غفلت نہ کرتے) تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے پھر تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے پھر اس دن تم سے ضرور بالضرور نعمتوں کے بارے میں سوال ہو گا۔" (سورۃ التکاثر:۱۔۸)

یہ آیات کریمہ صریحاً اس امر پر شاہد ہیں کہ انسان کی مال و دولت کی ہوس اسے اس کی صحیح منزل سے بھٹکا دیتی ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ

وَالْاَوْلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾

"خوب جان رکھو کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل تماشہ، زینت اور آپس میں فخر (وغرور) اور مال واولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے آپ کو زیادہ بتلانا ہے، جیسے بارش اور اس کی پیداوار کسانوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر جب وہ خشک ہو جاتی ہے تو زرد رنگ میں تم اس کو دیکھتے ہو پھر وہ بالکل چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں (کافروں کے لیے) سخت عذاب اور (مومنین کے لیے) خدا کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی متاع فریب کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

(سورۃ الحدید: ۲۰)

اگر انسان اپنی طلب کو ضروریات کی تکمیل تک محدود رکھے تو وہ حد میں رہتا ہے۔ لیکن اگر نفس کے گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ہوس انسان کو کسی حد کا پابند نہیں رہنے دیتی کیونکہ اس کی کوئی حد ممکن ہی نہیں۔ انسان جتنا مال و دولت حاصل کرتا جاتا ہے اس کی ہوس اتنی ہی مزید بڑھتی جاتی ہے اور پورا معاشرہ دولت کی ایک اندھی دوڑ کا شکار ہو کر تباہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ انسان اگر جذبات سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے سوچے تو وہ خود جان سکتا ہے کہ یہ روش کس قدر تباہ کن ہوتی ہے اور اگر مزید تدبر کیا جائے تو بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ روش انسانوں کو جس جہنم میں لے جاتی ہے اس کا انسان خود بھی اندازہ لگا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس اندھی دوڑ سے ایک لمحے کے لیے الگ ہو کر سوچے۔ لیکن اس اندھی دوڑ کا کمال ہی یہ ہوتا ہے کہ انسان فہم و تدبر، عقل و بصیرت سے محروم ہو کر محض ایک دوسرے کے ساتھ تعداد میں اضافے کی جنگ میں اس طرح الجھ جاتا ہے کہ جب وہ جہنم کی آگ کو یقین کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے تو اس کی آنکھ کھلتی ہے لیکن ظاہر ہے اس وقت اس آنکھ کا کھلنا، نہ کھلنا سب برابر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مال و دولت کی اندھی ہوس بھی محض تباہی کا ہی دوسرا نام ہے۔

چھٹا قانون: تقسیم دولت میں عدم مساوات سے تباہی

یہ ایک سیدھا سادا قانون فطرت ہے کہ معاشرے اور معیشت میں درجات کا فرق لازمی ہے۔ ہر شخص اللہ تعالیٰ کی جانب سے یکساں نوعیت کی صلاحیتیں لے کر نہیں آتا، اگر ایسا ہوتا تو انسانوں اور جانوروں یا انسانوں اور مشینوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور نام نہاد سوشلزم کا لاطبقاتی معاشرے کا خواب پورا ہو سکتا تھا لیکن بہرحال ایسا نہیں ہے۔

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٣٢﴾

"کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟ ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے اور جو کچھ یہ جمع کرتے ہیں تمہارے رب کی رحمت اس سے کہیں بہتر ہے۔" (سورۃ الزخرف:۳۲)

تاہم درجات کا یہ فرق جس کے بغیر معاشرت اور معیشت کا تصور بھی ممکن نہیں انسان کے ہاتھوں خود اس کی اپنی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو کمانے کی نسبتاً زیادہ استعداد رکھتے ہیں بالعموم ناجائز اور حرام ذرائع سے دولت میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں اور بتدریج معاشرے اور معیشت کے تمام یا بیشتر وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں، ان کی ہوس صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ معیشت کے تمام وسائل کا رخ صرف اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیشت میں دولت کی تقسیم میں شدید عدم مساوات پیدا ہو جاتی ہے اور پورا معاشرہ صرف دو طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے: ایک وہ جو دولت مند ہوتے ہیں (which they have) اور ایک غریب جو نان نفقہ سے بھی محروم ہو جاتے ہیں (which they don't have) دولت کی تقسیم میں یہ ناہمواری قوم اور معیشت دونوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

باب۔ 7

قوموں کے زوال کے قوانین

جہاں تک مختلف قوموں کے زوال کا تعلق ہے، قرآن مجید میں اس حوالے سے بھی قوانین بیان کیئے گئے ہیں۔ اس ضمن میں بنیادی وجوہات میں باطل ذرائعِ رزق مثلاً ربا وغیرہ سے آمدنی کا حصول، طاغوتی نظام کی اطاعت، تقلید، جنسی بے راہ روی، طاقت کا ناحق غرور، آیات خداوندی (احکام الٰہی) کی تکذیب اور توبہ و استغفار سے اجتناب وغیرہ شامل ہیں۔ ان عوامل کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

پہلا قانون: باطل ذرائع سے رزق حاصل کرنے کی وجہ سے تباہی

ازروئے قرآن ایسے افراد یا اقوام جو باطل ذرائع سے رزق حاصل کرتے ہیں ان کی تباہی لازمی ہے۔ اس حقیقت کا اثبات مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے بخوبی ہوتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿٢٩﴾

"اے اہل ایمان! ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ مگر باہمی رضامندی سے تجارت جائز ہے اور اپنے نفوس کو ہلاکت میں نہ ڈالو! اللہ یقیناً تم پر بار بار رحم کرنے والا ہے۔" (سورۃ النساء:۲۹)

اس آیت کریمہ میں اہل ایمان کو اس امر سے منع کیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھائیں۔ یہاں لفظ باطل پر تدبر ضروری ہے۔ اس کا مادہ ب، ط، ل ہے۔ اس کے معنی ہر اس چیز، تصور یا نظریے کے ہیں جو حق نہ ہو یا کوئی بھی ایسا نظریہ، رائے، تصور یا عمل جو منطق اور تجربے کی کسوٹی پر پورا نہ اترے، ثبات و استواری سے محروم ہو، اس بنیاد پر ہر ضائع ہو جانے والی شے یا حکمت سے خالی نظریہ یا عمل باطل ہے۔ اس کے معنی غلط، ناجائز، جھوٹ کے بھی ہیں۔

اس حوالے سے دوسرا لفظ قتل ہے۔ اس کا مادہ ق، ت، ل ہے۔ اس کے معنی ہتھیار کی ضرب یا پتھر یا زہر وغیرہ سے کسی کو مار ڈالنا، جان نکال دینا، قتل کرنا کے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے معنی ذلیل و خوار کرنے، حقیر کرنے اور جھکا دینے کے بھی ہیں۔ قتل کے معنی کسی کو اس حالت میں لے جانے کے بھی ہیں کہ کوئی اس کی بات پر دھیان نہ دے یا کوئی اس کی پرواہ نہ کرے یا اس کا اثر ختم کر دیا جائے۔

اس پس منظر میں اس آیت کریمہ سے جو پہلا نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اہل ایمان کو باہمی لین دین یا تجارت کے کسی بھی ایسے طریقے سے منع کر دیا گیا ہے جو حق نہ ہو یا بالفاظ دیگر جسے قرآن مجید تسلیم نہ کرتا ہو۔ ظاہر ہے ازروئے قرآن معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ اس بنیاد پر وہ تمام ذرائع باطل متصور ہوں گے جہاں ماسوا محنت کسی بھی ذریعہ سے مال کمایا گیا ہو۔ اس حوالے سے مفصل بحث میری کتاب "مروجہ اسلامی معاشی تصورات قرآنی تناظر میں" ملے گی۔

غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں اس قسم کے تمام ذرائع کو جو ماسوا محنت، آمدنی پیدا کرتے ہیں باطل قرار دیا گیا ہے اور باطل کے معنی محض ضائع ہو جانیوالی شے کے ہوتے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ماسوا محنت تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی صرف اور صرف ضائع ہو جانے والی ہوتی ہے، انسان اسے اپنے پاس روکنے پر قادر ہی نہیں ہے۔ یہی بنیادی نکتہ مندرجہ ذیل آیت میں بالواسطہ انداز میں بیان کیا گیا ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾

"انسان کے لیے اس کی سعی سے ماسوا کچھ بھی نہیں۔" (سورۃ النجم:۳۹)

یعنی انسان کو صرف اور صرف وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے اور کوئی بھی ایسی شے جو اسے اس کی محنت کے علاوہ حاصل ہو خواہ وہ آمدنی ہو یا کوئی بھی دیگر شے انسان اسے اپنے پاس رکھنے پر قادر ہی نہیں ہے، لہٰذا ایسی آمدنی کا کیا فائدہ جسے انسان اپنے پاس رکھ ہی نہ سکے اور وہ محض ضائع ہو جانے والی ہو۔

غیر مکتسب آمدنی کے نتیجے میں نفسِ انسانی شدید ضُعف وعدم توازن کا شکار ہوتا ہے

ازروئے قرآن غیر مکتسب آمدنی کے نتیجے میں نفس انسانی شدید ضعف وعدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾

"جو لوگ ربا کھاتے ہیں وہ (اپنے نفس کا) توازن قائم نہیں (رکھ) پاتے اور اس شخص کی مانند ہو جاتے ہیں جسے شدید قلبی اضطراب، اذیت (وجنون) نے اللہ کی رحمت سے دور کر دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو ربا کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام اور جو شخص اپنے پاس آئی ہوئی اللہ تعالیٰ کی اس نصیحت کو سن کر رک گیا اس کا معاملہ اللہ کی جانب ہے اور جو پھر لوٹ گیا وہ جہنمی ہے ایسے لوگ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔"

(سورۃ البقرہ:۲۷۵)

یہ آیت کریمہ ربا (غیر مکتسب آمدنی) کے نتائج کے حوالے سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اس حوالے سے متعدد نکات پر تدبر ضروری ہے۔

i) ربا کے منفی نتائج ربا لینے والے کے لیے ہیں، دینے والے کے لیے نہیں

اس آیت کریمہ کے ابتدائی الفاظ پر غور کیجیے "جو لوگ ربا کھاتے ہیں۔" با الفاظ دیگر

اس آیت میں ربا کے جو منفی نتائج بیان کیئے گئے ہیں وہ ان تمام لوگوں کے لیے ہیں جو ربا وصول کرتے ہیں۔

ii) ربا کے منفی نتائج تمام نوع انسانی کے لیے یکساں ہیں

آیت کے ابتدائی الفاظ اس امر کی کھلی شہادت ہیں کہ ربا کے منفی نتائج تمام نوع انسانی کے لیے ہیں یعنی جو لوگ بھی، کبھی بھی، کہیں بھی ربا وصول کریں گے وہ انہی منفی نتائج کا سامنا کریں گے جو اس آیت میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

iii) یہ نتائج آفاقی ہیں

اس آیت کے پھر ابتدائی الفاظ پر غور کیجیے **فعل مضارع** استعمال کیا گیا ہے، جو عربی زبان میں حال اور مستقبل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ربا کے منفی نتائج اس دنیا اور آخرت دونوں کے لیے ہیں۔ باالفاظ دیگر ربا کے بیان کردہ منفی نتائج کو جب بھی، کہیں بھی جانچا جائے گا اس کے نتائج وہی ہوں گے جو اس آیت میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ باالفاظ دیگر یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو ہر دفعہ یکساں حالات میں دہرائے جانے پر یکساں نتائج ہی دے گا۔ غور کیجیے کیا یہ سائنس سے ہٹ کر ہے؟ جی نہیں یہ قطعی سائنسی صورت حال ہے صرف جانچ کی شرط ہے۔

ربا صرف ضُعف نہیں بلکہ ضُعف در ضُعف پیدا کرتا ہے

جہاں تک ربا کا تعلق ہے، ازروئے قرآن یہ صرف ضُعف ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ ضُعف در ضُعف پیدا کرتا ہے۔ باالفاظ دیگر اضمحلال، کمزوری کو انتہا پر لے جاتا ہے۔ اس کمزوری میں ہر قسم کی کمزوری شامل ہے۔ اس حقیقت کا اثبات مندرجہ ذیل آیت قرآنی سے بخوبی ہوتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوا۟ ٱلرِّبَوٰٓا۟ أَضْعَٰفًا مُّضَٰعَفَةً ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٠﴾

"اے اہل ایمان! ضُعف در ضُعف پیدا کرنے والا ربا مت کھاؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔" (سورۃ آل عمران:۱۳۰)

اس آیت کریمہ میں 'اضعافا مضعفة' کا ترجمہ دوگنا اور چار گنا کیا جاتا ہے اور اس بنیاد پر آیت کے ابتدائی الفاظ کا ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے:

"اے اہل ایمان! دوگنا اور چار گنا ہونے والا سود مت کھاؤ۔"

اس بنیاد پر ایک خیال یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی واحد آیت ہے جس میں ربا کا مقداری بیان موجود ہے اور اس بنیاد پر یہ نتیجہ حاصل کیا جاتا ہے کہ ازروئے قرآن صرف وہ ربا ممنوع ہے جو غیر معمولی شرح سود کا حاصل ہو، یعنی جو دوگنا تا چار گنا تک ہو جانے والا ہو اور اگر شرح سود کم ہو تو وہ جائز ہے۔

ظاہر ہے یہ ایک قطعی بے بنیاد استدلال ہے۔ اگر اسے مان لیا جائے کہ صرف دوگنا اور چار گنا ہونے والا ربا ممنوع ہے تو اس بنیاد پر ۹۹ فیصد تک شرح سود یا ربا خود بخود جائز ہو جائے گی لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ ظاہر ہے یہ ممکن نہیں ہے۔ ازروئے قرآن اصل زر بمع تمام اثاثہ جات پر کسی بھی صورت میں، کوئی بھی رقم، کسی بھی شکل و مقدار میں وصول نہیں کی جاسکتی۔ در حقیقت متذکرہ بالا آیت کریمہ کے الفاظ "اضعافا اور مضعفة" دونوں کا مادہ ض، ع، ف ہے۔ اس کے معنی کمزوری اور ضُعف کے ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں بھی یہ مادہ آیا ہے بیشتر مقامات پر اسے کمزوری یا ضُعف کے معنوں میں ہی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً قوۃ کے مقابلے ضُعف (سورۃ الروم: ۵۴)، کمزوری اور حقارت کے معنوں میں (سورۃ الاعراف: ۱۵۰) اور (سورۃ النساء: ۷۵) وغیرہ۔

متذکرہ بالا آیت (سورۃ آل عمران: ۱۳۰) میں بھی مضاعفة دراصل ضعف سے ہے (ض کے اوپر پیش) ضُعف (ض کے نیچے زیر) ضِعف سے نہیں۔ لہٰذا اس کے معنی دوگنے اور چار گنے ہونے کے نہیں بلکہ ضُعف اور کمزوری کے ہیں۔

لہٰذا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ربا صرف اور صرف ضُعف کو بڑھاتا ہے اور یہ کمزوری کسی بھی شکل میں ہو سکتی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوتی ہے تو زیادہ صحیح ہو گا۔ اس کے نتیجے میں اقوام تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

دوسرا قانون: طاغوتی نظام کی اطاعت سے اقوام کی تباہی کا قانون

ازروئے قرآن قوموں کے زوال کی ایک اور اہم وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ قومیں بذات

خود گمراہ ہو جاتی ہیں اور ایسے حکمرانوں کی اطاعت کرنے لگ جاتی ہیں جو خود خاسرین میں شمار ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر یہ کلیہ بہت حد تک درست ثابت ہو جاتا ہے کہ جیسی قومیں ہوتی ہیں ان پر ویسے ہی حکمران مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔ طاغوتی نظام کی اطاعت سے اقوام کی تباہی کے کلیے کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

"اگر کوئی قوم خود بھی باطل افعال میں ملوث ہو اور طاغوتی نظام کی اطاعت بھی کرتی ہو تو یہ افعال اس کی مکمل تباہی پر منتج ہوتے ہیں۔"

یہ قانون بنیادی طور پر دو حصوں پر مشتمل ہے: اول یہ کہ اقوام کا بذات خود منفی طرز عمل اور دوم ان کی جانب سے طاغوتی نظام یا ایسے حکمرانوں کی اطاعت جو بذات خود خاسرین ہوں۔ ایسے زعما اور رہنما خود تو برباد ہوتے ہی ہیں اپنے ساتھ اپنی پوری قوم کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ جہاں تک خاسرین کا تعلق ہے ازروئے قرآن یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ پر افتراء باندھتے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں (سورۃ ھود:۱۸۔۱۹) زمین میں فساد پھیلاتے ہیں (سورۃ البقرہ:۲۷)، دنیاوی زندگی کو اخروی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں (سورۃ النحل:۱۰۷۔۱۰۹)، انسانوں کی اطاعت کرتے ہیں (المؤمنون:۳۴) یہ وہ لوگ ہیں جن پر شیطان نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ (سورۃ المجادلہ:۱۹)، ناپ تول میں کمی کرنے والے (سورۃ المطففین:۱۔۵)، اللہ کے احکامات کے منکر (سورۃ الطلاق:۸۔۹) اللہ کی گرفت سے بے فکر (سورۃ الاعراف:۹۹)، اللہ کی کتاب کے منکر (سورۃ البقرہ:۱۲۱)، اولاد کو ذلیل و خوار کرنے والے اور حلال کو حرام قرار دینے والے (سورۃ الانعام:۱۴۰) رسمی عبادت گذار (سورۃ الحج:۱۱)۔

اندازہ کیجیے جب حکمرانوں کا طرز عمل اس قسم کا ہو گا تو وہ اپنی قوم کو تباہ کرنے میں کونسی کسر چھوڑیں گے؟

تیسرا قانون: تقلید کی وجہ سے تباہی

قوموں کے زوال یا تباہی کی وجوہات میں قرآن مجید تقلید کو نمایاں اہمیت دیتا ہے، اگر ان تمام اقوام کا تجزیہ کیا جائے جن کے زوال و تباہی کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے تو کم و بیش تمام اقوام میں جو سبب مشترک رہا ہے وہ تقلید کا عنصر ہے۔

تقلید کیا ہے؟

تقلید سے مراد اسلاف کی اندھادھند پیروی ہے یعنی انسانی زندگی کے مختلف معاملات میں اسلاف کی رائے کو حرف آخر قرار دے دینا اور آنکھیں بند کر کے ان کی آراء پر عمل کرتے چلے جانا، یہ دیکھے بغیر کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ کیونکہ تقلید کے تحت انسانی عقل و شعور کا استعمال ممنوع ہوتا ہے اور یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ جملہ معاملات زندگی میں جو ہمارے آباؤ اجداد کہہ گئے ہیں وہ پتھر کی لکیر ہے جس میں کوئی ترمیم و اضافہ ممکن نہیں ہے۔

تقلید کے حوالے سے اقوام عالم کا عمومی طرز عمل

اس حوالے سے جہاں تک ان اقوام کا تعلق ہے جن کا تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے ان کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید نے ان اقوام کے زوال و تباہی کے اسباب میں تقلید کو ایک بنیادی عامل کے طور پر گنوایا ہے۔ بالفاظ دیگر مقلدانہ ذہنیت روئے زمین پر موجود ہر قوم میں مشترکہ طور پر موجود رہی ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید نے اسے تقریباً ایک کلیے کی شکل میں اس طرح بیان کیا ہے:

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾

"اس طرح آپ سے پہلے بھی ہم نے جس بستی میں بھی ڈرانے والا بھیجا وہاں کے مترفین نے یہی جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ داد کو اس راہ پر پایا ہم تو انہی کی پیروی کرنے والے ہیں۔ (نبی نے) کہا بھی کہ اگرچہ میں تمہارے پاس اس سے بہت بہتر طریقہ لے کر آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ داد کو پایا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس کے منکر ہیں جسے دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے۔"

(سورۃ الزخرف:۲۳۔۲۴)

اس مضمون کا اعادہ (سورۃ السباء:۳۴) میں بھی کیا گیا ہے۔ ان آیات کریمہ میں متعدد پہلوؤں پر تدبر لازمی ہے۔ مثلاً:

۱- ایک عمومی رجحان

ان آیات کریمہ کی رو سے مقلدانہ ذہنیت ایک عمومی رجحان ہے۔ ازروئے قرآن جس بستی میں بھی اللہ نے اپنے رسولوں کو بھیجا وہاں تقلید کا رجحان ایک لازمی عنصر کے طور پر موجود تھا اور اس میں کوئی استثنیٰ بھی نہیں، گویا تقلید کا پہلو تمام اقوام عالم میں مشترکہ طور پر موجود رہا ہے۔

۲- طبقۂ مترفین کی جانب سے مخالفت

اس ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کو سب سے پہلی اور بنیادی مخالفت کا سامنا ہمیشہ طبقۂ مترفین کی جانب سے کرنا پڑا ہے۔ یہاں لفظ مترفین پر تدبر ضروری ہے۔ اس لفظ کا مادہ ت، ر، ف ہے۔ اس کے معنی آسودگی، خوشحالی، فارغ البالی، عیش و عشرت اور آسودگی کے ہیں۔ المترف اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مکمل عیش و عشرت اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہا ہو اور اس بنیاد پر لذات و شہوات میں بڑھتا چلا جائے اور اس میں بدمست ہو جائے یا ایسا شخص جو کچھ اس کے دل میں آئے وہ کرتا چلا جائے اور کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہ ہو اور اس بنیاد پر سرکش ہو جائے۔ مترفون اور مترفین اس کی جمع ہیں۔

۳- مخالفت کا انداز یا اسلوب

یہاں جو امر قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس طبقہ نے انبیاء کی انقلابی تعلیم کے خلاف مخالفت کا انداز کیوں اپنایا؟ متذکرہ بالا آیات کی رو سے ان کا جواب یہ تھا کہ یہ تعلیم ان کے آباؤاجداد کے مسلک کے خلاف ہے لہٰذا ہم اسے قبول نہیں کر سکتے۔

تقلید کا دنیاوی انجام

ازروئے قرآن ایسی تمام اقوام جو مندرجہ بالا طرز عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں مشیت ایزدی ان سے انتقام لیتی ہے اور انہیں تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ متذکرہ بالا آیات (سورۃ الزخرف:۲۳-۲۴) جن کے حوالے سے یہ بحث جاری ہے ان سے متصل اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تقلید کا دنیاوی انجام بھی بتا دیا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾

"پس ہم نے ان سے انتقام لیا اور دیکھ لیجیے کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔"

(سورۃ الزخرف:۲۵)

اس آیت کریمہ کی رو سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے انتقام لیتا ہے جیسا کہ اس آیت میں استعمال ہونے والے لفظ فانتقمنا سے واضح ہے۔ یہاں یہ ضروری ہے کہ اس نکتے پر تدبر کیا جائے کہ اللہ کے انتقام سے کیا مراد ہے؟

انتقام کا مادہ ن،ق،م ہے۔ اس کے معنی وسط یا راہ کے درمیانی حصے کے ہوتے ہیں اس کے علاوہ اس کے معنی کسی کو ناپسندیدہ یا معیوب قرار دینا اور برائی کا بدلہ برائی سے دینے کے بھی ہیں۔ اسی بنیاد پر المنتقمہ کے معنی جرم کی سزا دینے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک صفت ذوانتقام (سورۃ آل عمران:۴) بیان کی ہے۔ اس سے مراد قانون مکافات عمل ہے جس کے تحت ہر شخص کو اس کے کیئے کی جزا یا سزا ملتی ہے۔ اسی حوالے سے قوم فرعون کے لیے کہا گیا کہ:

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ "ہم نے ان سے انتقام لیا۔" (سورۃ الاعراف:۱۳۶)

یا یوں کہہ لیجیئے کہ انہیں ان کی بداعمالیوں کی سزا دی گئی۔ اسی بنیاد پر سورۃ السجدہ میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

"ہم مجرموں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیتے ہیں۔" (سورۃ السجدہ:۲۲)

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے انتقام سے مراد اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اعمال کا بدلہ ہے۔

اب اگر اس آیت (سورۃ الزخرف:۲۵) اور اس سے متصل گذشتہ دو (۲) آیات (سورۃ الزخرف:۲۳۔۲۴) سے مجموعی طور پر نتیجہ اخذ کیا جائے تو صورت حال یہ ہوگی جو قوم بھی، کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت احکام خداوندی کی اطاعت سے انکار کرے گی اور تقلید کی بھول بھلیوں میں کھو جائے گی اس کا انجام صرف اور صرف تباہی ہے اس سے ماسوا کچھ بھی نہیں۔ یاد رکھیئے یہ قرآن کا قانون ہے جس میں سرمو انحراف کی کوئی گنجائش نہ کبھی تھی، نہ ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔

مترفین کا انجام

اقوام کا طبقہ اشرافیہ جو محض عارضی دنیاوی لذائذ اور عیاشی کے لیے استحصالی نظام ترتیب دیتا ہے اور دنیا میں دوسروں کی محنت پر خوب عیش کرتا ہے ان کا انجام کیا ہوگا؟ اس کی وضاحت قرآن مجید کی ان آیات میں کی گئی ہے۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۗ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۙ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۚ

"اور بائیں بازو والے، بائیں بازو والوں کی بد نصیبی کا کیا ٹھکانہ؟ وہ لو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی میں ہوں گے اور سخت کالے دھویں کے سائے میں جو نہ ٹھنڈا ہو گا نہ آرام دہ، یقیناً یہ وہ لوگ تھے جو اپنی خوشحالی میں مگن تھے۔"

(سورۃ الواقعہ: ۴۱۔۴۵)

تقلید کا اخروی انجام

جہاں تک تقلید کے اخروی انجام کا تعلق ہے، ازروئے قرآن تمام مقلدین[1] کا ٹھکانہ صرف اور صرف جہنم ہے اس کا اندازہ سورۃ حٰم السجدہ کی مندرجہ ذیل آیت سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝

"اور کافر کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں جن و انس (دونوں کے وہ فریق) دکھا جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا (تاکہ) ہم انہیں اپنے قدموں تلے روند ڈالیں تاکہ وہ جہنم میں سب سے نیچے ہو جائیں۔" (سورۃ حٰم السجدہ: ۲۹)

اس آیت کریمہ میں پہلا توجہ طلب امر یہ ہے کہ مقلدین کو بغیر کسی استثناء کے خود اللہ تعالیٰ نے کافر قرار دیا ہے کیونکہ یہاں ان کے لیے جو الفاظ آئے ہیں وہ صریحاً اس امر پر

[1] قرآن وسنت سے استنباط شدہ مسائل میں، دلیل کے ساتھ کسی عالم کی تقلید اس میں شامل نہیں ہے۔ یہاں تقلید اور مقلدین سے مراد شرک و کفر میں اسلاف کی اندھا دھند اطاعت ہے۔

غماز ہیں کہ یہ واویلا مقلدین ہی کی جانب سے ہو سکتا ہے اور کسی کی جانب سے نہیں کیونکہ یہاں ان کفار کی جانب سے اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرنا کہ ہمیں وہ فریق دکھا جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ اس امر پر کھلی دلالت ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اسلاف کی تعلیمات پر آنکھیں بند کر کے اندھا اعتماد کیا۔ وہ تعلیمات غلط تھیں جن پر عمل کے نتیجے میں یہ تباہی کے گڑھے جا گرے اور اب روز قیامت یہ شور مچا رہے ہیں کہ اے باری تعالیٰ ہمیں وہ لوگ دکھا دے جن کی تعلیمات پر عمل کر کے ہم اس انجام کو پہنچے ہیں تا کہ ان کو یہ اپنے پیروں تلے روند ڈالیں۔

یہاں انتہائی غور طلب نکتہ یہ ہے کہ کفار کی جانب سے اس درخواست کا بارگاہ رب العزت کی جانب سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اس کی وجہ بہت سیدھی سادی ہے اور وہ یہ کہ ازروئے قرآن روز قیامت حساب کتاب کا عمل ترتیب زمانی کے اعتبار سے ہو گا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیئے میری کتاب "احوال قیامت ازروئے قرآن") اس حوالے سے یہاں گمراہ کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین کی من مانی، خود ساختہ اور اپنے مفادات پر مبنی تشریحات کیں اور آنے والی نسلوں نے ڈھور ڈنگر کی طرح ان کا تنقیحی جائزہ لیے بغیر اندھا دھند اس پر عمل کیا۔

لہٰذا ایسے لوگ جنہوں نے ماضی میں کبھی دانستہ یا نادانستہ دین کی غلط تشریحات کی ہوں گی وہ تو اپنے اپنے عہد کے اعتبار سے جزا اور سزا کے عمل سے گذر چکے ہوں گے۔ اور ان کے بعد آنے والے جنہوں نے ان غلط تشریحات اور تعبیرات کو آنکھیں بند کر کے مانا اور گمراہوں میں شامل ہو گئے وہ وہاں بعد از مرگ واویلا مچا رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں ان لوگوں کو دکھا دے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ لیکن ظاہر ہے وہ انہیں وہاں دکھائی نہیں دیں گے، کیونکہ وہ ان سے پہلے حساب کتاب کے عمل سے گذر چکے ہوں گے اور قدرت کے کارخانے میں رجعت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔

اس امر کو ایک مثال کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آج پندرہویں صدی ہجری میں ہم ربا (سود) کی تعریف تیسری صدی ہجری کے علماء و فقہاء کی تحریروں کو حتمی جان کر کرتے ہیں۔ (یہ صورت حال ظاہر ہے صرف ربا (سود) کے حوالے سے ہی نہیں

مجملہ تمام معاملات میں ہے) یہ تعریف مکمل طور پر ملوکیت زدہ فکر کی نمائندہ ہے جس کی رو سے صرف کرنسی کا کرایہ ربا (سود) ہے باقی ہر قسم کے اثاثے کا کرایہ جائز ہے جو کہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ اب اگر اس فعل کفر کی بنیاد پر آج (پندرھویں ہجری) کا کوئی شخص جہنم میں جاتا ہے اور وہاں وہ یہ واویلا کرے کہ اے میرے رب! ان علماء و فقہاء کو میرے سامنے لا جنہوں نے ربا کی یہ غلط تعبیر و تعریف کی تھی، تو ظاہر ہے اس میں غلطی خود اس شخص کی ہے کہ اس نے خود کیوں نہیں اس تعریف کا تنقیدی جائزہ لیا، اسے قرآنی تناظر میں کیوں نہیں پرکھا؟ وہ علماء اور فقہاء تو اپنی اپنی جگہ سزا یا جزا سے ہمکنار ہو چکے ہوں گے۔ آج کے اس شخص کا یہ واویلا تو بعد از مرگ ہی متصور ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ان کی اس درخواست کو اتنا بھی قابل اعتنا نہیں جانا کہ اس کا جواب بھی دیا جاتا۔

متذکرہ بالا آیت (سورۃ حٰم السجدہ:۲۹) میں کسی حد تک بالواسطہ انداز میں مقلدین کے انجام کو بتایا گیا ہے تاہم سورۃ صافات میں قطعی واضح اور دوٹوک انداز میں ان کے بدترین انجام کی صراحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

"کیا یہ مہمانی اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ جسے ہم نے ظالموں کے لیے سخت آزمائش بنا رکھا ہے، بے شک وہ درخت جہنم کی جڑ میں سے نکلتا ہے جس کے خوشے شیطانوں کے سروں جیسے ہوتے ہیں (جہنمی) اسی درخت میں سے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے پھر اس پر گرم جلتے ہوئے پانی کی سلونی ہو گی پھر ان سب کا لوٹنا جہنم کی طرف ہو گا۔ یقیناً یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ / راہ ضلالت پر پایا اور یہ انہی کے نقش قدم پر دوڑتے رہے اور ان سے

پہلے بھی بہت سے بہک چکے ہیں جن میں ہم نے رسول بھیجے تھے اب آپ دیکھ لیں کہ جنہیں متنبہ کیا گیا تھا ان کا انجام کیا ہوا۔" (سورۃ الصافات:۶۲۔۷۳)

ان آیات کریمہ میں مقلدین کے انجام کی صراحت کر دی گئی کہ وہ کس قسم کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ جہاں تک ان مقلدین کے طرز عمل کا تعلق ہے اس کی وضاحت (سورۃ الصافات:۶۹۔۷۰) میں بخوبی کر دی گئی ہے جہاں یہ کہا گیا کہ انہوں نے اپنے آباء و اجداد کو راہ ضلالت پر پایا۔ اس مقصد کے لیے ان آیات میں لفظ ضآلین آیا ہے۔ اس لفظ کا مادہ ض، ل، ل، ہے۔ اس کے معنی حیرت زدہ / متحیر ہونے یا سرگرداں پھرنے، کسی شے کے غائب ہو جانے، مختلف اشیاء کے اس طرح باہم مل جانے کے ہیں کہ انہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ بھول جانے، دلیل نہ سوجھنے یا کسی بات کے حافظے سے محو ہو جانے کے بھی ہیں۔ ضلالۃ سے مراد سیدھی راہ سے ہٹ جانے کے ہیں چاہے وہ عمداً ہو یا سہواً، معمولی درجے میں ہو یا بالکلیۃ۔ اس کے علاوہ کوششوں کے ضائع ہونے، رائیگاں چلے جانے، کسی امر پر قادر نہ رہنے، ہلاکت و نامرادی کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔

قرآن مجید میں اسے ہدایت کے مقابلے میں (سورۃ البقرہ:۱۶) میں لایا گیا ہے۔ سورۃ ابراہیم میں کوششوں کے ناکام و نامراد رہ جانے کو ضلال کہا گیا ہے۔ (سورۃ ابراہیم:۱۸) ہلاکت و بربادی کے معنوں میں (سورۃ الحجر:۵۶)، ضائع ہو جانے، یا ختم ہو جانے کے مفہوم میں (سورۃ السجدہ:۱۰)، ناکامی، بھٹکنے، غلط راہ کے معنی میں (سورۃ الفیل:۲) میں لایا گیا ہے۔ سورۃ فاتحہ میں اسے اللہ تعالیٰ کی منجملہ تمام نعمتوں سے محرومی کے لیے لایا گیا ہے (سورۃ الفاتحہ:۷)۔ اس امر سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اسلاف جن کی اندھادھند پیروی کی جاتی ہے قرآن مجید انہیں کس مقام پر رکھتا ہے۔ جہاں تک اس اندھادھند پیروی کا تعلق ہے اس طرز عمل کی وضاحت کے لیے متذکرہ بالا آیات میں سے آیت (سورۃ الصافات:۷۰) کے دو الفاظ اثٰر اور یہرعون پر تدبر لازمی ہے۔

ان میں سے پہلے لفظ اثر کا مادہ ا، ث، ر ہے۔ اس کے معنی کسی کھنڈر کے باقی رہ جانے والے حصے کے ہیں۔ اصحاب لغت کے نزدیک اس کے چار بنیادی معنی ہیں: اول کسی چیز سے حاصل ہونے والا نتیجہ، دوم علامت، سوم خبر اور چہارم حکم۔ قرآن مجید میں اسے مختلف

مقامات پر انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً نشانی یا علامت کے معنوں میں (سورۃ الروم:۵۰) اور (سورۃ المومن:۲۱) نقش قدم کے معنوں میں (سورۃ الکہف: ۶۴)، (سورۃ الحدید:۲۷) میں آیا ہے۔ الاثر کے معنی پیچھے چلنے اور پیروی کرنے کے ہیں ان معنوں میں یہ (سورۃ طٰہٰ:۸۵۔۹۶) میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ ترجیح دینے کے معنوں میں بھی متعدد آیات قرآنی میں آیا ہے مثلاً (سورۃ الاعلیٰ:۱۶)، (سورۃ الحشر:۹) اور (سورۃ طٰہٰ:۷۲) وغیرہ۔

جہاں تک دوسرے لفظ یھرعون کا تعلق ہے اس سے مراد تیزی اور اضطراب سے پہنچنا، شدت و شوق جس میں مضطربانہ تیزی ہو یا جہاں انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے۔

اس پس منظر میں ازروئے قرآن مقلد انسان مکمل طور پر جذبات کے تحت اپنے آباء واجداد کے نقش قدم پر مضطربانہ انداز میں حرکت کرتا ہے اور دنیا میں مقلدین کا طرز عمل اسی قسم کا ہوتا ہے اور اس کے تحت وہ عقل و شعور، ادراک اور سمجھ بوجھ سے ماورا ہو جاتے ہیں جو محض حیوانیت ہے۔ دنیا میں مقلدین کا یہی طرز عمل ہے جس کی قرآن مجید کی اس آیت کریمہ میں نشاندہی کی گئی ہے۔

اس پورے پس منظر میں یہ بات قطعی واضح ہے کہ ازروئے قرآن مقلدین جن اسلاف کی پیروی کرتے ہیں وہ خود مکمل طور پر گمراہ تھے۔ لفظ ضآلین اس کی بین شہادت ہے۔ ایسے لوگوں کی جو خود راہ ہدایت سے بھٹکے ہوئے ہوں ان کے نقش قدم یا انکے اقوال پر اندھادھند عمل جو صرف اور صرف جذبات کے تحت ہو اور عقل و شعور کا دور کا بھی واسطہ نہ ہو، مقلدین کا اس دنیا میں شیوہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ امر ذہن میں رکھیئے کہ قوم لوط کی ذہنی کیفیت کی نشاندہی کے لیے بھی قرآن مجید میں یھرعون کی اصطلاح آئی ہے اور مقلدین کے لیے بھی جو بذات خود ایک بہت معنی خیز امر ہے۔ باالفاظ دیگر ازروئے قرآن قوم لوط علیہ السلام اور مقلدین کی ذہنی کیفیت قطعی یکساں ہے۔

ظاہر ہے اس قسم کے طرز عمل کا انجام ماسوا جہنم اور کیا ہو سکتا ہے؟ مقلدین جہنم میں جس اذیت سے دوچار ہوں گے اس کی وضاحت مندرجہ بالا آیات کریمہ میں واضح طور پر کر دی گئی ہے۔ انہیں زقوم کے درخت کی میزبانی ملے گی۔ اس حوالے سے جہاں تک زقوم کا

تعلق ہے اس کا مادہ ز، ق، م ہے۔ اس کے معنی لقمہ بنانا، نگل لینا، کسی ناپسندیدہ چیز کو نگلنا کے ہیں۔ زقوم ایک جنگلی پودا ہوتا ہے جس کی بو بہت تیز اور کڑوی ہوتی ہے۔ اس کے پتے بھی بہت بدہیئت ہوتے ہیں۔ الزقوم سے مراد ایسا کھانا ہوتا ہے جو زہریلا اور قاتل ہو۔ اس کا استعمال ایسے مواقع کے لیے بھی کیا جاتا ہے جب کوئی کام کسی کے لیے بری طرح وبالِ جان بن جائے۔ باالفاظ دیگر مقلدین کو جہنم میں ایک ایسے درخت کے پھل ملیں گے جو ان کے لیے سخت اذیت کا سبب ہوں گے جو انہیں مجبوراً نگلنے ہوں گے کیونکہ اس کے علاوہ ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اس کے بعد پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔ اندازہ کیجیے اس کرب واذیت کا جس کا شکار مقلدین، جہنم میں ہوں گے۔

ایک ضمنی پہلو: جہنم میں زقوم کے درخت کی موجودگی

مندرجہ بالا آیات کریمہ (سورۃ الصافات:۶۲۔۶۳) میں جہنم کی تہہ سے زقوم کے درخت کے نکلنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کی عجیب وغریب توضیحات کی گئی ہیں۔ بعض نے اسے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا ہے چونکہ جہنم میں ہر طرف آگ ہی آگ ہوگی لہذا وہاں درخت کس طرح ممکن ہے؟ لہذا یہ محض ایک تشبیہ یا استعارہ ہے۔ یہاں یہ امر ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایک غلطی جو فکری لحاظ سے عام طور پر کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس دنیا کے حالات و واقعات یا اصول و قوانین کے مجموعے یا اپنے اردگرد کے ماحول کو بغیر سوچے سمجھے مابعد قیامت کے حالات پر منطبق کر دیتے ہیں۔ چونکہ اس دنیا میں درخت لکڑی کا ہوتا ہے اور لکڑی آگ سے جل جاتی ہے لہذا یہ فرض کر لیا گیا کہ یہ درخت بھی لکڑی کا ہی ہوگا اور جہنم میں چونکہ ہر طرف آگ ہی آگ ہوگی لہذا وہاں درخت کا کیا سوال؟

یہاں یہ امر ذہن میں رکھیئے ازروئے قرآن زمان ومکان کے وہ پیمانے جو اس دنیا کے لیے ہیں وہ ازروئے قرآن صرف قیامت تک کے لیے ہیں ممکنہ طور پر اسی وجہ سے قیامت کو جن مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے ان میں ایک نام یوم الآخر بھی ہے یعنی اس زمان ومکان کا آخری دن۔ (تفصیل کے لیے دیکھیئے میری کتاب "احوال قیامت ازروئے قرآن" اور

"ارتقاء حیات ازروئے قرآن") اس بنیاد پر یہ عین ممکن ہے کہ ان الگ پیمانوں کے مطابق جو جنت اور جہنم میں ہوں گے ایسے درخت کی جہنم میں موجودگی قطعی بعید از عقل و قیاس نہیں ہے۔ جب ہم اس زمان و مکان کی بابت سرے سے علم نہیں رکھتے تو ہمیں بہر حال یہ حق حاصل نہیں کہ اس دنیا کے پیمانوں پر اُس دنیا کو قیاس کرتے ہوئے کسی امر کا انکار کر سکیں۔ یہ الفاظ چونکہ قرآن مجید کے ہیں اور قطعی واضح اور دوٹوک انداز میں کہا گیا ہے لہذا ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ جہنم میں ایسا ہی ہو گا اس بنیاد پر کہ چونکہ قرآن مجید نے کہا ہے لہذا بر حق ہے اور لاریب کہ ایسا ہی ہو گا۔

چوتھا قانون: جنسی بے راہ روی کی وجہ سے تباہی

قوموں پر آنے والے زوال کی ایک اور وجہ ازروئے قرآن جنسی بے راہ روی بھی ہے جسے خاص طور پر آج کے دور کے لحاظ سے بہت اہمیت حاصل ہے بالخصوص مغرب میں یہ ایک کھلے آسیب کی طرح مسلط ہے جہاں یہ معاملہ بڑی حد تک انتہائی حد پر جا چکا ہے۔ باقی دنیا بھی ظاہر ہے اس سے محفوظ نہیں اور یہ کہیں خفی اور کہیں جلی انداز میں بہ لحاظ شدت کم یا زیادہ ہر جگہ موجود ہے۔ ازروئے قرآن جنسی بے راہ روی قوموں کے زوال کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔

اس حوالے سے مشیت ایزدی کا سیدھا سا قانون یہ ہے کہ "کوئی بھی قوم جو جنسی بے راہ روی میں تمام حدود کو پھلانگ جائے تو دنیاوی اور اخروی تباہی اس قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔"

یہاں جنسی بے راہ روی سے مراد مرد وزن کے ایسے تمام جنسی تعلقات ہیں جو ماسوا نکاح / شادی کے قائم کیئے جائیں چاہے یہ مخالف جنس کے مابین ہوں یا یکساں جنس کے درمیان (Homo Sexuality) اس کے علاوہ اس میں بے حیائی کی منجملہ تمام اقسام کی سرگرمیاں بھی شامل ہیں خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ یہاں بے حیائی سے مراد اس قسم کی تمام سرگرمیاں ہیں جن کے نتیجے میں بلاواسطہ یا بلاواسطہ جنسی ہیجان پیدا ہوتا ہو۔

ایک عملی مثال

اس حوالے سے قرآن مجید قوم لوط کی مثال دیتا ہے جو جنسی بے راہ روی میں تمام

حدود کو پھلانگ گئی تھی۔ یہ قوم اغلام میں مبتلا تھی، ان کی مجالس میں بے حیائی کے مناظر عام تھے۔ یہ لوگ کھلے عام فحش حرکات کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جنسی جذبہ ان کی تمام تر سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں پر غالب آ گیا تھا اور ازروئے قرآن اس ضمن میں وہ حالت سُکر میں چلے گئے تھے۔ حالتِ سُکر سے مراد ایک ایسی حالت ہوتی ہے جس میں انسان سوچنے سمجھنے سے معذور ہو جائے۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جب ان افعال کے نتیجے میں تباہی لازم آجاتی ہے جو قوم لوط پر آئی اور وہ تاریخ میں ذلت کی ایک ابدی علامت بن گئی۔

ظاہر ہے یہ صورتحال قوم لوطؑ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، پوری انسانی تاریخ میں جب بھی، کہیں بھی کوئی بھی فرد یا قوم اس حوالے سے اس حالت تک پہنچے گی تباہی اس کا حتمی مقدر بن جائے گی۔

جنسی بے راہ روی حدود اللہ کی خلاف ورزی ہے

قرآن مجید میں متعدد افعال کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کی حدود ہیں ان کی خلاف ورزی مت کرنا، ان افعال میں ایک فعل اغلام یا جنسی بے راہ روی بھی ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿١٦٦﴾

"اہل عالم میں سے تم ہی وہ ہو جو مردوں کے پاس (قضائے شہوت کے لیے) جاتے ہو اور تمہاری جن عورتوں کو اللہ نے تمہارے لیے زوج بنایا ہے ان کو چھوڑ دیتے ہو اور تم حد سے گذر جانے والی قوم ہو۔" (سورۃ الشعراء:١٦٥۔١٦٦)

اس آیت کریمہ میں اغلام کو واضح طور پر حدود اللہ کی خلاف ورزی بتایا گیا ہے لیکن ظاہر ہے صرف اغلام ہی نہیں منجملہ تمام اقسام کی بے حیائی اس میں شامل ہو گی کیونکہ اغلام تو بے حیائی یا فحاشی سے ہی جنم لیتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ صرف اغلام ہی حدود فراموشی ہے، صحیح نہیں ہو گا۔ اس آیت میں قوم لوطؑ کو قوم عدوان بھی کہا گیا ہے یعنی حد سے گذر جانے والی قوم۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی قسم کی بے حیائی جس کا نکتہ عروج زنا یا اغلام ہے افراد و اقوام میں سست روی، اضمحلال اور پس مردگی وغیرہ پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں

طویل عرصے میں افراد یا اقوام تباہ و برباد ہو جاتے ہیں دوم یہ افعال خود انسانی شخصیت میں عدم توازن پیدا کرتے ہیں۔ یہ افعال مادہ منویہ کا اسراف ہیں اور اسراف کی نوعیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو روزِ ازل سے کاتب تقدیر نے اس کا انجام تباہی لکھا ہے اور حرفِ آخر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تمام افعال کو کرنے سے روکا ہے، اس قسم کا فعل کرنے والے ان حدود اللہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور حدود اللہ کی خلاف ورزی کا انجام پھر تباہی ہے۔ گویا جنسی بے راہ روی سے افراد اور اقوام ان چاروں حوالوں سے تباہ و برباد ہوتے ہیں۔

پانچواں قانون: طاقت کا ناحق غرور اور اس سے تباہی

مشیت ایزدی سے طے شدہ اس قانون کے مطابق کسی بھی قسم کے تکبر کی سزا ہمیشہ فی الفور ملتی ہے چاہے یہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح۔ پر اس قانون کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝

"عاد نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور کہنے لگے ہم سے قوت میں زیادہ کون ہے؟ کیا انہیں یہ نظر نہ آیا کہ وہ جس نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے قوت میں کہیں زیادہ طاقتور (و اختیار) والا ہے وہ (آخر تک) ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔ ہم نے (ان کے لیے) فوری طور پر مخصوص ایام میں تند و تیز آندھی طلب کی تا کہ انہیں دنیا کی زندگی میں ذلت کے عذاب کا مزا چکھادیں اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ رسوائی والا ہے جہاں ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔"

(سورۃ حٰم السجدہ:۱۵۔۱۶)

ازروئے قرآن عاد نے اپنے علاقے (ملک) میں بغیر کسی جواز یا حق کے تکبر کیا اور اللہ کی متعین کردہ حدود کی خلاف ورزی کی اور ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول گئے کہ تمام تر قوتوں کا

منبع وماخذ صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے اور وہ ایک ایسی عظیم الشان قوت ہے۔ کہ اس جیسی کوئی قوت اس پوری کائنات میں نہیں اس کی کوئی مثل ونظیر نہیں۔ اس کائنات کی بقیہ تمام قوتیں خود اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور وہ اپنی ربوبیت کے لیے خود اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی صرف اور صرف عبدیت ہی ممکن ہے، لیکن اگر کوئی فرد یا قوم اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کرکے بزعم خویش خود کو کسی طاقت کا حامل سمجھنے لگے تو یہ صورتحال ایک طرف تو خود اس کی بصیرت کے اندھے پن کی غماز ہوگی تو دوسری طرف اس صورتحال میں مشیت ایزدی کے طے شدہ قانون کے مطابق اس قسم کے احمقانہ فعل کا ردعمل قطعی فوری اور باسرعت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کی منجملہ تمام قوتوں کا یک و تنہا مالک ہے وہ اپنی ملک میں موجود کسی بھی قوت کے ذریعے یا اسے طلب کرکے اس قسم کے بصیرت کے اندھوں کو ایسی ذلت آمیز سزا دیتا ہے کہ وہ رہتی دنیا تک عبرت کی علامت بن جاتے ہیں اور آخرت کی ذلت اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔

یہ ہماری روزمرہ زندگی کا بہت عام مشاہدہ ہے کہ کوئی بھی شخص کہیں بھی، کبھی بھی، کسی بھی حوالے سے جب بھی تکبر کا مظاہرہ کرتا ہے تو اسے اس کی سزا فوراً ملتی ہے اور اکثر اوقات قطعی سرعت کے ساتھ ملتی ہے۔ یہ صورتحال انفرادی سطح پر بھی ہے اور اجتماعی سطح پر بھی، فرق صرف تکبر کی سطح کا ہوتا ہے۔ تکبر کی سطح جتنی بلند ہوگی اتنی ہی ذلت مقدر ہوجاتی ہے اور اس معاملے میں اللہ کا قانون کبھی کسی سے، کسی حوالے سے رعایت نہیں کرتا، تکبر کا انجام دنیاوی اخروی ذلت کی شکل میں فی الفور چکا دیا جاتا ہے۔ قوم عاد نے تکبر کیا انہیں اس کی سزا فوراً مل گئی۔ ظاہر ہے یہ تقدیر صرف قوم عاد تک محدود نہیں رہتی، انسانیت تک اللہ کا ایک ہی قانون ہے اور سب کے لیے ہے۔ غرور کا سر ہمیشہ سے نیچا ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

یہاں توجہ طلب امر یہ بھی ہے کہ (سورۃ حٰم السجدہ:۱۵) میں اللہ تعالیٰ نے ایسے متکبر لوگوں کی بابت یہ کہا ہے کہ جب وہ تکبر کرتے ہیں تو انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ وہ ہستی جس نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ یہاں لفظ یرو کا استعمال اس امر کی کھلی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حتمی اور کلی برتری کا اظہار مرئی طور پر یعنی ایسے عوامل سے بھی

ہوتا ہے جنہیں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے اور غیر مرئی طور پر بھی، یعنی جنہیں بربنائے بصیرت دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن تکبر کے نتیجے میں انسان ان تمام بین حقائق و شواہد کو دیکھنے سے معذور ہو جاتا ہے، اس کی بصارت و بصیرت دونوں جواب دے جاتی ہیں۔ ورنہ جیسا کہ آیت مذکور میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اگر ان کی یہ صلاحیت باقی ہوتی تو انہیں نظر آجاتا کہ وہ قوت جس نے انہیں پیدا کیا ہے اس کے آگے ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ قرآنی اصطلاح میں جو آنکھیں ماتھے پر ہوتی ہیں وہ اندھی نہیں ہوتیں بلکہ جو دل سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں (سورۃ الحج:۴۶)۔

چھٹا قانون: آیاتِ الٰہی سے انکار کے نتیجے میں تباہی

اگر ان تمام اقوام کا تجزیہ کیا جائے جن کی تباہی یا زوال کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے تو یہ امر دیکھا جاسکتا ہے کہ ان منجملہ تمام اقوام نے آیات الٰہی کا انکار کیا یا ان کی تکذیب کی، اس ضمن میں کسی قسم کا کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔ تمام اقوام کا طرز عمل اس ضمن میں قطعی یکساں رہا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں؟ یعنی وہ کونسی وجوہات تھیں جن کی بنا پر تمام اقوام نے احکام الٰہی کی تعمیل سے انکار کیا اور نتیجے کے طور پر تباہ و برباد ہو گئیں؟ بالفاظ دیگر وہ کون سے عوامل تھے جو اس راہ میں مانع ہوئے؟

ازروئے قرآن اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کی دو (۲) بنیادی وجوہات ہیں: اول حُبِ دنیا اور دوم قیامت کا انکار۔ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو درحقیقت یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ حُب دنیا کی وجہ سے انسان آخرت سے لاپرواہ ہو جاتا ہے اور اگر آخرت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے (خواہ یہ انکار خفی ہو یا جلی) تو سگ دنیا بن جاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

"جن لوگوں کو ہمارے پاس واپس آنے کی امید نہیں ہے وہ دنیاوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اسی پر مطمئن ہیں اور جو لوگ ہماری آیات سے غافل ہیں،

ایسے لوگوں کا ٹھکانہ ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے۔" (سورۃ یونس:۷۔۸)

ان آیات کریمہ میں قطعی واضح اور دوٹوک انداز میں ایسے لوگوں کے بارے میں بتایا گیا ہے جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر ہی مطمئن ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے یہی وہ لوگ ہیں جو احکام الٰہی سے مکمل غافل ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ درحقیقت یہ دونوں افعال ایک دوسرے کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہیں۔ ابتدا قیامت کے تصور کے انکار سے ہوتی ہے، یہ انکار خفی یا جلی دونوں صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ خفی انکار یہ ہوتا ہے کہ انسان بظاہر روز قیامت پر یقین کا مدعی ہوتا ہے لیکن اس کا عمل اس کے خلاف ہوتا ہے۔ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ وہ انتہائی حد تک اس کا مبلغ ہو لیکن عملی لحاظ سے وہ اس سے اتنا ہی دور ہو، اس قسم کے لوگ ہمیں اپنی ارد گرد کی زندگی میں بالعموم مل جاتے ہیں جو عقائد کے معاملے میں تو انتہا پسند ہوتے ہیں لیکن وہ عقائد جس طرز عمل کا مطالبہ کرتے ہیں ان کا عمل اس سے کوسوں دور ہوتا ہے، یہ قیامت کا خفی انکار ہے۔ جہاں تک کھلے انکار کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے بدیہی ہوتا ہے۔ منکر کھلے عام تسلیم کرتا ہے کہ وہ قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

یہ فعل یعنی قیامت کا انکار خواہ خفی ہو یا جلی ایک ہی نتیجہ پیدا کرتا ہے اور وہ ہے دنیا کی محبت اور اس پر مطمئن ہو جانا۔ اس حوالے سے مندرجہ بالا آیات میں دو الفاظ آئے ہیں: اول رضوا اور دوم طمانوا، ان کا انفرادی تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔

رضوا کا مادہ ر، ض، ی ہے۔ اس کے معنی ہیں راضی ہونا، خوش ہونا، کسی سے متفق ہونا، کسی کی بات کی تصویب کرنا اور یہ سب کچھ دل کی رضامندی اور رغبت سے ہو اور بلا کسی کراہت و جبر کے ہونا چاہیئے۔ قرآن مجید میں صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا گیا:

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

"اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔" (سورۃ التوبہ:۱۰۰)

اسی طرح بیعت رضوان کے حوالے سے ارشاد ربانی ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

"بلاشبہ اللہ ان مومنین سے راضی ہو گیا جو درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔" (سورۃ الفتح:۱۸)

کسی شے پر ریجھ جانے اور قناعت کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ

"کیاتم آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا کی زندگی پر ریجھ گئے ہو۔" (سورۃ التوبہ:۳۸)

اسی طرح واطمأنوا کا مادہ ط، م، ن ہے۔ اس کے معنی ہی خلجان کے بعد نفس کا سکون پذیر ہونا۔ تسلی بخش ہو جانا۔ مطمئن ہو جانا۔ (سورۃ آل عمران:۱۲۶) میں اسے اطمینان اور تسلی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ نفس مطمئنہ، وہ نفس جسے برائی کی طرف کسی طور پر بھی رغبت نہ ہو۔

اور اس کو خوف کے ختم ہو جانے کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ (سورۃ النساء:۱۰۳)

اس لیے یہاں کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جو دنیا کی حیات ہی پر مطمئن ہو گئے۔ اس کو ہی سب کچھ سمجھ رہے ہیں، کسی اور چیز کی طرف رغبت ہی نہیں۔ آخرت کا فکر ہی نہیں۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ایسے لوگ اپنی رضا و رغبت سے صرف اور صرف دنیا کو اپنا مقصود و منتہا بنالیتے ہیں اور اسی پر ریجھ کر رہ جاتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس سے اوپر اٹھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے لیے کتے کی مثال بلا وجہ نہیں دی گئی ہے۔ اب اگر دنیا ہی سب کچھ ہو اور تمام جد و جہد کا مرکز و محور اسی کو بنالیا جائے تو ظاہر ہے احکام خداوندی یا الہامی دلائل و براہین کی گنجائش کہاں بچے گی؟ کیونکہ احکام خداوندی کی رو سے اگرچہ کہ دنیا کے حصول پر کوئی پابندی نہیں ہے:

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

"دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو۔" (سورۃ القصص:۷۷)

لیکن ان حدود و قیود اور شرائط و ضوابط کے ساتھ جنہیں احکام خداوندی یا اللہ کی آیات کہا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر آیات خداوندی انسان کی دنیاوی ہوس پر ایک خودکار روک لگا کر اسے اعلیٰ ترین اور بلند تر مقاصد کی جانب رجوع کرنے پر مجبور کرتی ہیں جو انسانیت کی سطح ہے لیکن یہ حدود و قیود دنیاوی مفادات کے ماروں کے لیے بوجھ بن جاتی ہیں لہٰذا وہ انہیں سرے سے نظر انداز کر دیتے ہیں، نتیجہ ظاہر ہے سوائے جہنم کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ان کی

آنکھ ازروئے قرآن اس وقت کھلتی ہے جب عذاب خداوندی کا کوڑا ان کے سر پر برستا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

"یقیناً ان لوگوں کے حق میں آپ کے رب کی بات ثابت ہو چکی کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے گو ان کے پاس تمام نشانیاں پہنچ جائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں۔" (سورۃ الیونس:۹۶۔۹۷)

ان آیات کریمہ میں ایسے افراد کی نقشہ کشی کی گئی ہے جنہوں نے آیات الٰہی کو مکمل پس پشت ڈال دیا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے کسی قسم کی کوئی دلیل یا برھان سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، تا آنکہ عذاب خداوندی ان کے سر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس وقت نہ کوئی توبہ ممکن ہو سکتی ہے نہ رجوع کی کوئی گنجائش باقی ہوتی ہے۔ اس وقت اگر وہ ایمان لے بھی آئیں تو بھی اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ

"جب وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے تو اس وقت ان کے ایمان نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔" (سورۃ المؤمن:۸۵)

ساتواں قانون: توبہ و استغفار سے اجتناب سے تباہی

ایک اہم عامل جس کا قرآن مجید میں تباہ ہونے والی اقوام کے حوالے سے خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ و استغفار سے اجتناب بھی ہے۔ مشیت ایزدی سے طے شدہ اس قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے "انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ و استغفار کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی نعمتوں کا حصول ہے اور اعراض سے تباہی لازم آ جاتی ہے۔"

توبہ و استغفار ایسے افعال ہیں جن کے دروازے ہر وقت، ہر کس و ناکس کے لیے کھلے رہتے ہیں ماسوا ان لوگوں کے لیے جن کے لیے قرآن مجید میں صراحت کر دی گئی کہ ان کی

توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

قرآن مجید میں جن اقوام کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے ان کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسی اقوام جو اپنے اعمال بد کی وجہ سے تباہی کے عین کنارے پر پہنچ گئی ہوں انہیں بھی اللہ تعالیٰ کی شان رحیمیت راہ ہدایت پر واپس آنے یعنی اپنے گذشتہ اعمال سے توبہ اور استغفار کا ایک موقعہ ضرور دیتی ہے۔ اگر کوئی قوم اس صورتحال کا ادراک کرلے اور توبہ کرلے تو اسے اصلاح احوال کا موقعہ لازمی فراہم کیا جاتا ہے لیکن اگر کوئی اس موقعہ سے فائدہ نہ اٹھانا چاہے تو ظاہر ہے اس کا انجام ماسوا تباہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس قانون کو قوم نوح کے حوالے سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ﴿۱۲﴾ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ﴿۱۳﴾

"اور (حضرت) نوح (علیہ السلام) نے کہا! اپنے رب سے استغفار کرو! وہ یقیناً بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے مینہ برسائے گا اور مال واولاد سے تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہیں باغ عطا کرے گا ان میں تمہارے لیے نہریں نکال دے گا۔ تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ سے وقار کے لیے رجوع نہیں کرتے؟" (سورۃ النوح: ۱۰۔۱۳)

سورۃ نوح کی مندرجہ بالا آیات سادہ طور پر مندرجہ بالا قانون ہی کا بیان ہیں۔ ازروئے قرآن یہ الفاظ حضرت نوح علیہ السلام کے ہیں جو اپنی قوم کو اس کی روش (جو تباہ کن نتائج کی حامل تھی) تبدیل کرنے اور راہ ہدایت اختیار کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس پیغام میں حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی بیان کر دی ہے کہ اگر کوئی قوم توبہ و استغفار کرے اور راہ ہدایت اختیار کرے تو اس پر اللہ کی نعمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اسی حوالے سے ان آیات میں سے آخری آیت (سورۃ النوح:۱۳) کا متذکرہ بالا ترجمہ اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ للہ سے مراد من اللہ (اللہ سے) ہے بصورت دیگر اس آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ تم اللہ کے لیے بزرگی اور عظمت کا یقین کیوں نہیں رکھتے۔ اول الذکر صورت میں اس سے مراد یہ ہو گی کہ جب انسان راہ راست پر چلتا ہے تو اس کا لامحالہ نتیجہ دنیاوی اور اخروی عزت

و کامیابی، بلند مرتبہ اور عظمت کا حصول ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے یہ خطاب کر رہے ہیں کہ تم راہ مستقیم پر چل کر اللہ کے قانون کے مطابق عزت و عظمت کے حصول کے خواستگار کیوں نہیں ہوتے ہو؟ جو کہ سب سے بہترین راہ ہے آخر کونسا امر تمہیں اس راہ کو اختیار کرنے میں مانع ہے؟

ثانی الذکر صورت میں بھی مفہوم کم و بیش یہی ہے کہ اگر قوم کو اللہ پر یقین ہو گا تو یقیناً اس کے قوانین پر بھی ہو گا اور اللہ کا قانون وہی ہے جس کا اس حوالے سے اوپر تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ تاہم اول الذکر مفہوم گذشتہ آیات کے ساتھ نسبتاً زیادہ مطابقت میں ہے۔ اس قانون کا اعادہ سورۃ نوح میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"(نوح علیہ السلام نے) کہا: اے میری قوم! میں تمہیں صاف صاف متنبہ کرنے والا ہوں۔ بے شک تم اللہ کی عبادت کرو، اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو وہ تمہارے گناہوں کے بد اثرات سے تمہیں ایک وقت مقرر تک تحفظ فراہم کرے گا یقیناً جب اللہ کا وعدہ آجاتا ہے تو مؤخر نہیں ہوتا کاش کہ تم علم رکھتے۔" (سورۃ النوح: ۲۔۴)

ان آیات کریمہ سے واضح ہے کہ اجتماعی سطح پر مکافات عمل کے بد اثرات سے بچنے کے لیے اللہ کی اطاعت اور اس کا تقویٰ اختیار کرنا لازمی ہے۔ صرف اور صرف یہی ایک راہ ایسی ہے جس سے قوموں کی اجتماعی اعمال بد کے منفی اثرات سے ایک مخصوص مدت تک نجات ممکن ہے، لیکن اگر کسی قوم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی اور وہ مکافات عمل کی زد میں آجائے تو پھر یہ عمل کسی صورت مؤخر نہیں ہوا کرتا، یہ اللہ کا قانون ہے جس میں کبھی کوئی استثنیٰ نہیں۔

اس ضمن میں جب حضرت ھود علیہ السلام نے اپنی قوم سے خطاب کیا تو ان منجملہ نعمتوں میں طاقت کی نعمت کا بھی تذکرہ کیا یعنی توبہ و استغفار سے نہ صرف یہ کہ دنیا جہاں کی نعمتیں ملتی ہیں بلکہ ایک اور نعمت اقوام کی طاقت و قوت کی شکل میں بھی ملتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ایسی اقوام کی دنیاوی شان و شوکت میں بھی اضافہ کر دیتا ہے۔

وَيٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا وَّيَزِدۡكُمۡ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمۡ وَلَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِيۡنَ﴿۵۲﴾

"اے میری قوم! اپنے رب سے استغفار کرو اور اس کی طرف رجوع کرو! وہ آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا اور تمہاری موجودہ قوت میں مزید اضافہ کردے گا اور مجرم بن کر (اللہ کی بندگی سے) منہ نہ موڑو۔" (سورۃ الھود:۵۲)

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ اگر اقوام اپنی موجودہ غلط روش کو چھوڑ کر اللہ کی راہ کی جانب رجوع کریں تو ان کو حاصل ہونے والی نعمتوں میں قوت جیسی نعمت کا اضافہ بھی شامل ہے۔

موقع سے فائدہ نہ اٹھانے کا نتیجہ: مکمل تباہی

ظاہر ہے ایسی اقوام جو اس موقعے سے فائدہ نہ اٹھا سکیں وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہیں، مکافات عمل کا کوڑا ان پر اس طرح برستا ہے کہ انہیں عبرت کا نشان بنا دیتا ہے۔ متذکرہ بالا دونوں اقوام یعنی قوم نوحؑ اور قوم عاد دونوں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، نتیجتاً دونوں خس و خاشاک ہو گئیں۔ قوم نوحؑ کو طوفان میں ڈبو دیا گیا:

مِمَّا خَطِيۡٓـئٰتِهِمۡ اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا ۙ فَلَمۡ يَجِدُوۡا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡصَارًا﴿۲۵﴾

"یہ لوگ اپنے گناہوں کے سبب ڈبو دیئے گئے اور جہنم میں پہنچا دیئے جائیں گے پھر اللہ کے سوا کسی کو انہوں نے اپنا مددگار نہیں پایا۔" (سورۃ النوح:۲۵)

یہی صورت حال قوم عاد کے ساتھ بھی ہوئی، ان کی بھی جڑ کاٹ دی گئی:

فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعۡنَا دَابِرَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ﴿۷۲﴾

"غرض ہم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیات (احکامات و قوانین) کو جھٹلایا تھا وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔" (سورۃ الاعراف: ۷۲)

ختم شد